فنون

احمد ندیم قاسمی

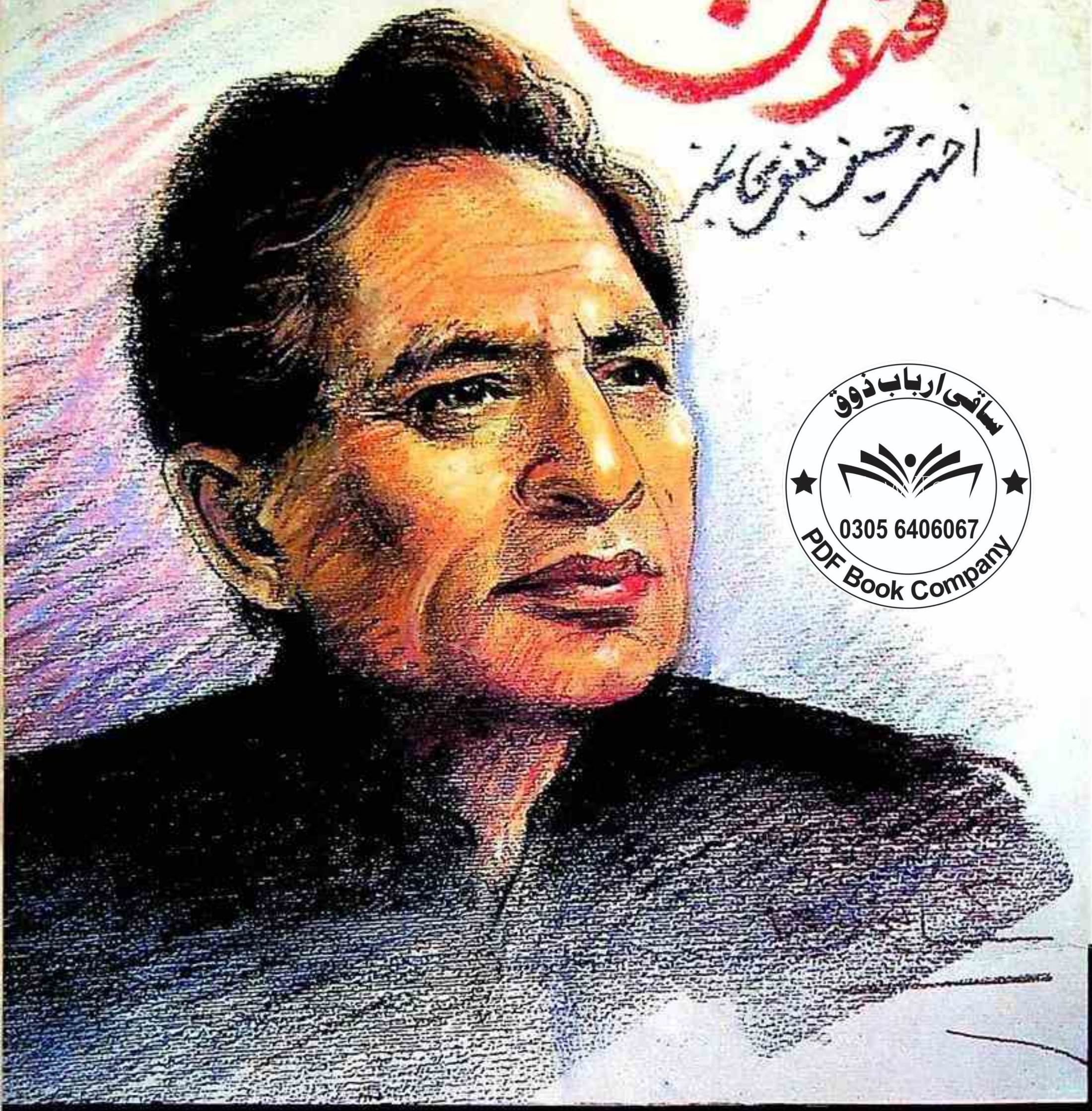

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ایڈیٹر: احمد ندیم قاسمی

گھر بیٹھے شالیمار کے
آڈیو اور وِڈیو پروگراموں
کا لُطف اُٹھائیے

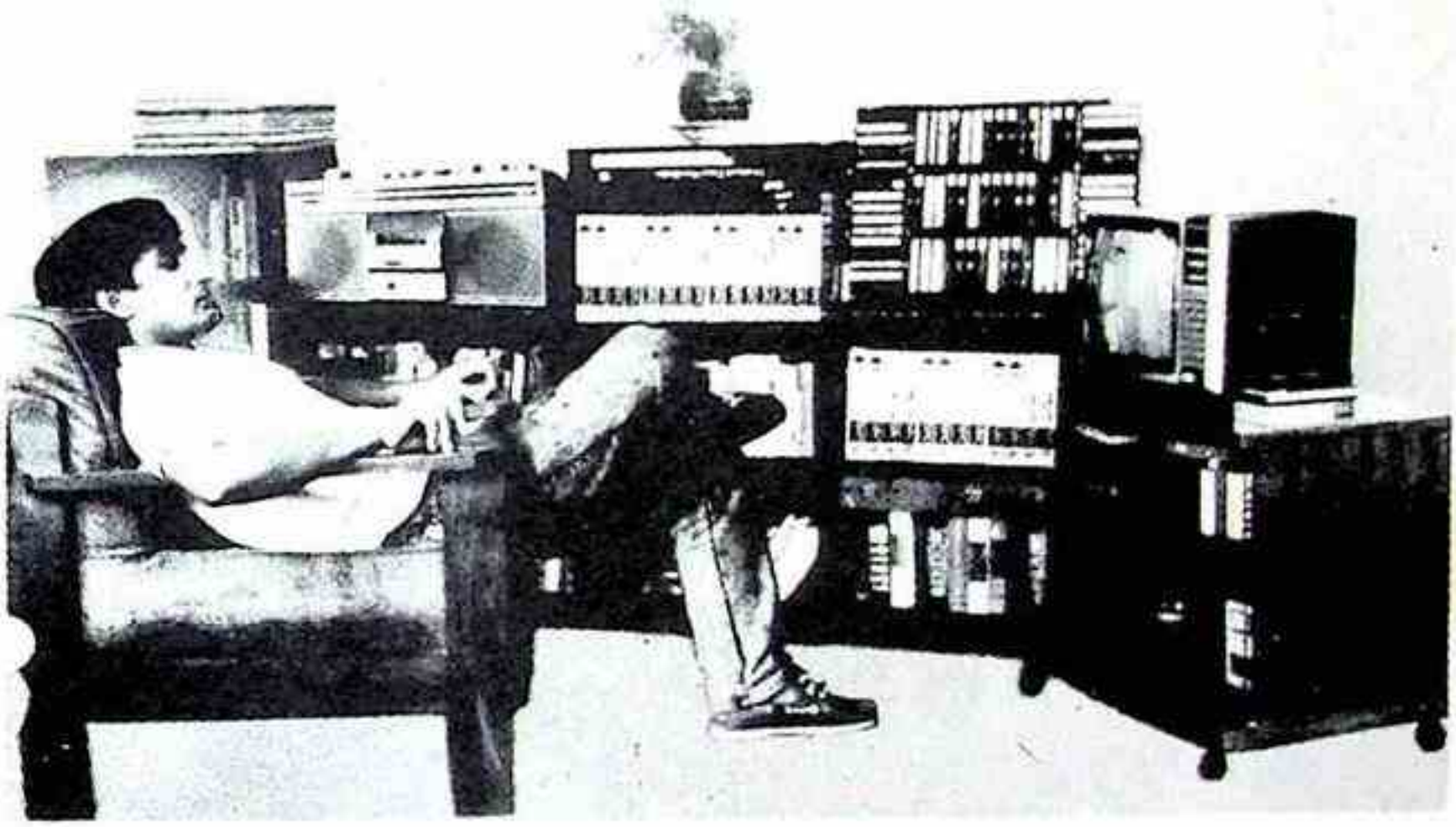

شالیمار آپ کے لیے معیاری وڈیو کیسٹس پر مقبول پاکستانی
ٹیلیویژن پروگراموں اور فلموں کا جامع انتخاب پیش
کرتا ہے۔ اس کے علاوہ آڈیو کیسٹس پر شالیمار
کے تیار کردہ مذہبی، تعلیمی و موسیقی کے پروگراموں کے
مکمل سلسلے بھی دستیاب ہیں۔

SRC

Shalimar Recording Company Limited
P.O. Box 1246, Islamabad (PAKISTAN)
Telex: 5597 SRC PK. Phones: 856171-2-3
(THE LARGEST RECORDING COMPANY IN PAKISTAN)

Shalimar

Lift with strength.
Lift with
Chaudhri Wire Rope.

The leading manufacturers of wire rope
in Pakistan

Chaudhri Wire Rope Industries Limited

MANUFACTURERS OF
STEEL WIRE ROPES,
STRANDED WIRE,
EARTH WIRE,
OHGW, GUY WIRES,
WIRE ROPE SLINGS, ETC.

1st Floor, 48 Nishtar (Brandreth) Road,
P.O. Box No. 1503, LAHORE
Factory: G.T. Road, Muridke,
Lahore, Pakistan)
GRAMS: "WIREROPE"
TELEX: CWR PK 4658
PHONES: 56468, 312802

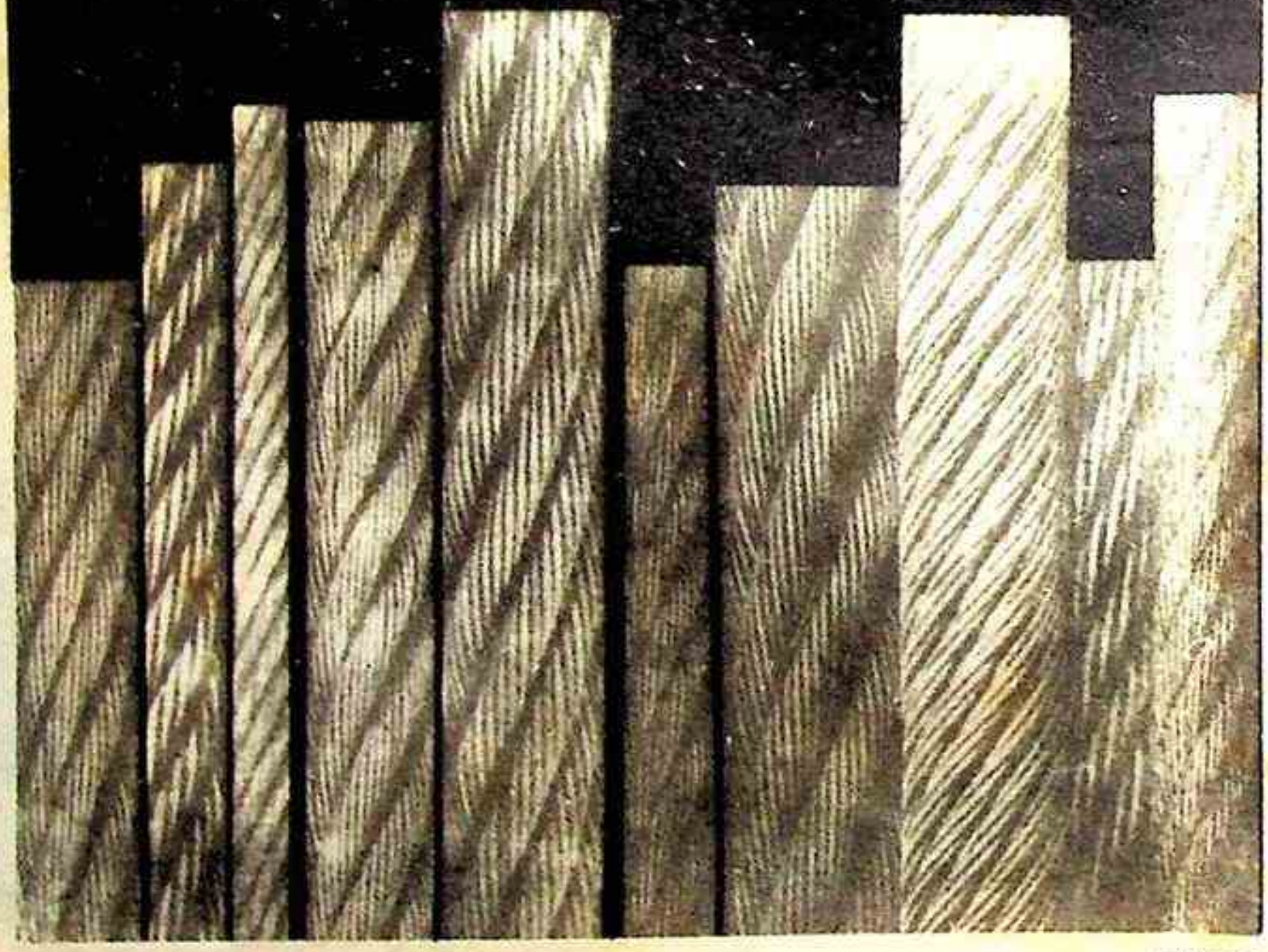

SCAN

تنویر کیبلز

پاکستان میں بجلی کے

بہترین،

قابلِ اعتماد

اور

معیاری

تار بنانے والے

گلبرگ، لاہور

بجلی کے میٹر

اب
پاکستان میں ہی
تیار ہوتے ہیں

- گھریلو استعمال کے لیے بجلی کے میٹر
- صنعتی مقاصد کے لیے بجلی کے میٹر
- کے وی اے آر ایچ اور میکسیمم ڈیمانڈ میٹر

ان سب کے لیے اور دُوسرے ہر طرح کے میٹروں کیلئے رجوع فرمائیں

سیّد بھائیز، فیروزپور روڈ، لاہور

عمدہ کام کی گارنٹی۔ مفت سروس اور نقص کی صُورت میں تبدیلی
کی ضمانت

عہد ساز شاعر

اختر حسین جعفری

کا آخری مجموعۂ کلام

"جہاں دریا اترتا ہے"

"آئینہ خانہ" سے بعد ان کے انتقال تک کا سارا بے مثال کلام

"جہاں دریا اترتا ہے"

میں شامل ہے۔ آرڈر اس پتے پر بھجوائیں۔

○

فردا پبلشنگ ہاؤس

سیکنڈ فلور، ای پلومر بلڈنگ

شاہراہِ قائداعظم، لاہور

رابطہ: ۲۲۱۷۰۱

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۵۷۹ ٹیلی فون نمبر ۲۱۵۷۶۳

فنون

لاہور

سہ ماہی

اختر حسین جعفری نمبر

مدیر ، احمد ندیم قاسمی

مدیر منتظم ، منصورہ احمد

تزئین کار ، موجد

شمارہ : ۳۶

مئی — اگست ۱۹۹۲ء

دستی	:	۲۰۰ روپے
بذریعہ رجسٹری	:	۲۵۰ روپے
غیر ممالک سے (بذریعہ عام ڈاک)	:	۴۰۰ روپے
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک)	:	۶۰۰ روپے

قیمت شمارہ ۳۶ : ۴۰ روپے

مقامِ اشاعت ۶/۲۹ ملک چیمبرز ، لوئر مال ۔ لاہور (پاکستان)

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

مندرجات

آخری اُجالا (نظم) — اختر حسین جعفری — ۸

حرفِ اوّل — ندیم — ۱۰

جسم اُترا ہے کس منزلِ عمر میں (سوانح) — یوسف حسن — ۱۱

وہ جس کے ذکر سے خانی، بھرا ہُوا اخبار — آفتاب اقبال شمیم — ۱۳

اختر حسین جعفری، میرا دوست — ضیاء الدین ضیاء — ۱۶

اپنے دوست، اختر حسین جعفری کے لئے

—— چند شعر — ضیاء الدین ضیاء — ۱۹

ملکتِ نظم کا والی (نظم) — قتیل شفائی — ۲۰

اختر حسین جعفری کے لیے ایک نظم — توصیف تبسم — ۲۱

ستارے کا نوحہ — خورشید رضوی — ۲۱

دریدہ دل، پریدہ رنگ (نظم) — احمد ظفر — ۲۲

بیاد اختر حسین جعفری (نظم) — گوہر ہوشیارپوری — ۲۳

آئینہ خانہ — محمد سلیم الرحمٰن — ۲۴

اختر حسین جعفری، ایک منفرد تخلیق کار — ڈاکٹر محمد علی صدیقی — ۲۷

قطعۂ تاریخِ وفات — محشر بدایونی — ۳۱

قطعۂ تاریخ — خالد احمد — ۳۱

غزل، اختر حسین جعفری کے لئے — شفیق سلیمی — ۳۱

بیادِ اختر حسین جعفری (نظم) — حزیں لدھیانوی — ۳۲

محبتوں کا سفیر اختر حسین جعفری (نظم) — روحی کنجاہی — ۳۳

جعفری کا نوحہ — امداد حمدانی — ۳۳

کبھی شہرِ جاناں میں (نظم) — اقبال کوثر — ۳۴

اب بہت دیر ہوگئی ہے (نظم) — اقبال کوثر — ۳۵

"ندیم بگشن نا آفریدہ (آئینہ خانہ)"
کے مرحوم شاعر سے ایک گفتگو کا تاثر — رشید ملک — ۴۰

دل سے کب اس کی یاد جاتی ہے — محمد کاظم — ۵۱

اختر حسین جعفری کے لیے (نظم) — خالد احمد — ۵۶

اختر حسین جعفری کا نوحہ — خالد احمد — ۵۸

غمِ لازوال (نظم) — خالد احمد — ۶۰

اختر حسین جعفری کے لیے (نظم) — خالد احمد — ۶۱

اختر حسین جعفری کے لیے ایک نظم — ایوب خاور — ۶۲

جعفری صاحب کے لیے (نظم) — ایوب خاور — ۶۳

اختر حسین جعفری کا "آئینہ خانہ" — فتح محمد ملک — ۶۴

اختر حسین جعفری، کچھ باتیں کچھ یادیں — ستار طاہر — ۶۹

جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار — شبنم شکیل — ۷۲

نوحہ گر کا نوحہ — سید حسن ناصر — ۷۳

اختر حسین جعفری کے لیے ایک نظم — صفدر صدیق رضی — ۷۳

نہیں سمجھتا (نظم) — احمد لطیف — ۷۴

نم دیدہ چپ کے نام (نظم) — احمد لطیف — ۷۵

ہمیں رستہ نہیں ملتا (نظم) — احمد رفیق — ۷۶

یہ فجر سے کون بچھڑا ہے (نظم) — اعجاز رضوی — ۷۶

اختر حسین جعفری کی شاعری کے ماخذات — آفتاب اقبال شمیم — ۷۷

کلاسیکی رکھ رکھاؤ کا حامل جدید شاعر

—— اختر حسین جعفری — ڈاکٹر سعادت سعید — ۷۹

خوں چکاں دلوں کا رفیق (نظم) — یوسف حسن — ۸۵

اختر حسین جعفری کی یاد میں (نظم) — اعتبار ساجد — ۸۵

اختر حسین جعفری (نظم) — مسرت ہاشمی — ۸۶

اختر حسین جعفری (نظم) — مسرت ہاشمی — ۸۶

ہر ایک تنہا سفر کرتا ہے (نظم) — پروفیسر محمد افضل — ۸۷

جعفری کے کلام کی روشنی میں، دعائیں — دلنواز دل — ۸۷

اختر حسین جعفری اور روپہلی سطر کا وعدہ — ڈاکٹر نوازش علی — ۸۸

"سخن درماندہ ہے" — منصورہ احمد — ۹۸

میں تیرا نوحہ کیسے لکھوں (نظم) — جاوید انور — ۱۰۴

شجر رزقِ خاک بنتا ہے (نظم) — اشرف جاوید — ۱۰۵

ہوا نوحہ کناں ہے (نظم) — ناہید شاہد — ۱۰۶

آئینہ خانہ اب بھی روشن ہے (نظم) — حسن عباس رضا — ۱۰۷

اختر حسین جعفری کی روح سے (نظم) — تصدق نثار — ۱۰۸

مدیرِ "فنون" سے، جعفری کی نذر (نظم) — تصدق نثار — ۱۰۹

بصیرتوں کے نقیب (نظم) — عابد ودود — ۱۰۹

اختر حسین جعفری کی یاد میں — نشاط انجم — ۱۱۰

دھانپ دو لوح و قلم — شکیل اختر — ۱۱۲

اختر حسین جعفری کی یاد میں (نظم) — شعیب آفریدی — ۱۱۵

اختر حسین جعفری کی یاد میں (نظم) — آثم میرزا — ۱۱۶

آب نیلیں میں شب (نظم) — آصف ہمایوں — ۱۱۷

دھوپ اور بارش (نظم) — آصف ہمایوں — ۱۱۷

سکوتِ گریاں (نظم) — ذوالفقار انجم — ۱۱۸

اختر حسین جعفری کے لیے ایک نظم — محمد مشتاق آثم — ۱۱۹

اختر حسین جعفری کے لیے ایک نظم — سجاد مرزا — ۱۱۹

اختر حسین جعفری کے لیے (نظم) — علی اصغر عباس — ۱۲۰

اختر حسین جعفری کے نام (نظم) — سید صفدر حسین جعفری — ۱۲۰

اختر حسین جعفری کے نام (نظم) — زمان کنجاہی — ۱۲۱

اختر حسین جعفری کی یاد میں (نظم) — لطیف ساحل — ۱۲۱

بس اک لمحے کی سازش نے (نظم) — غافر شہزاد — ۱۲۲

آؤ ماتم کریں (نظم) — غافر شہزاد — ۱۲۲

نذرِ اختر حسین جعفری (نظم) — جمشید چشتی — ۱۲۳

کتبہ (نظم) — منظر حسین اختر — ۱۲۴

ستارہ ابھی کہکشاں میں گھرا ہے (نظم) — منظر حسین اختر — ۱۲۵

اختر حسین جعفری، چند یادیں چند تاثرات — ایوب ندیم — ۱۲۶

اختر حسین جعفری سے آخری مکالمہ — تنویر ظہور — ۱۲۸

سرورق : شاہنواز زیدی

اختر حسین جعفری

آخری اُجالا

(۱)

تھکے تھکے ہو
بجھے بجھے ہو
بس اب تو پیشِ قدم یہی آخری اُجالا ہے
آخری آسمان کی آخری ترائی ہے
آخری شاخِ کہکشاں ہے
یہ مُہلتِ یک نفس جو تیرے نصیب میں ہے
اسے غنیمت شمار کرنا
جہاں کہیں شاخِ کہکشاں کی اُداس چھاؤں ہو
ایک پل کو وہاں سفر روک لو کہ خستہ قدم بہت ہو
تھکے ہوئے ہو
تھکے ہوئے آفتاب! تیرے غروب کا وقت آگیا ہے
یہ ایک پَل جو ازل سے پہلے کا ایک پل ہے
جو انتہاؤں کے بعد کی کوئی انتہا ہے
اس ایک پل میں ڈھکے چھپے سینکڑوں زمانے
شروع و آغازِ آفرینش کے گُنہ
اموات کے بہانے
تھکے ہوئے آفتاب! تیرے سفر کی مٹی میں میرا چہرہ ہے
میرے چہرے پہ منجمد اشک، داغ، دشنام، میری ساعت
مرا زمانہ، مرا جہاں ہے
کہ میں نے یہ داغ اپنے ابّا کے زرد رخسار پر بہنگامِ مرگ دیکھا تھا
میرے بھائی کی لاش پردیس سے جب آئی تھی اس کے تابوت پر
کچھ ایسے ہی نقشِ ضربات تھے، نشاں تھے
تھکے ہوئے آفتاب! تیرے اس ایک پل اور میرے
لمحے میں

کوئی تاریخ کا تصادم ہے یا تسلسل ہے یا کوئی جبر
مشترک ہے
تھکے ہوئے آفتاب! تیری یہ کس طرح کی نشانیاں ہیں!

(۲)

تپے ہوئے آسماں کو چھُونا
عجیب خواہش، عجب جُنوں ہے جو شامِ احساس پالتی ہے
دہکتے تنّور آفتابوں کی یا شہابوں کی ملکیت میں یہ
اپنی قسمت کا
پارۂ نان ہو کہ مہتاب
کیوں ابھی نیم پخت ہے، کیوں اناج اس کا
زباں پہ پُورا گھُلا نہیں ہے
دہکتے تنور —— ان کے اندر ہزار ہا سال کا
تجسّس سوال صورت سُلگ رہا ہے
یہ عصر سارے، سوال سارے
پیادہ پا کشتیوں، رتھوں، بیل گاڑیوں پر
اشارتوں پر، علامتوں پر سوار ہو کر، یہاں تک آئے تھے
اور کسی آگ کے عمق میں
اُتر گئے تھے

سوادِ معدومیاں کی تقسیم و ضرب سے جو ملا، یہی ہے
کسی تجسّس کا استخواں، وہم کا سراپا
تھکے ہوئے بیل، سست رہوار
منجمد اشک، داغ دشنام، لفظ، فرہنگ
گاڑیوں کے شکستہ پہیے کہ جن کے دل میں
دبی ہوئی خواہشِ سفر تا ہنوز زندہ
تپے ہُوئے آسماں کو چھُونا
جلی ہوئی انگلیوں کو سیّال آگ میں بار ہا بھگونا
اُداس ہونا
عجیب خواہش، عجب جُنوں ہے، جو شامِ احساس پالتی ہے

حرفِ اوّل

ندیم

اختر حسین جعفری

ایک محفل میں، جب اختر حسین جعفری اپنی ایک نظم پڑھ چکے ان کے ایک ہمعصر نے داد دیتے ہوئے کہا تھا۔ واہ۔ جعفری کیا خوبصورت گٹھے ہوئے مصرعے لکھتا ہے! یہی وہ نکتہ ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ ہم نظم بھی غزل کی طرح پڑھتے اور سنتے ہیں۔ یہ ہمارا صدیوں کا معمول ہے۔ ہم تحسین کے اس اسلوب کے عادی ہو چکے ہیں اور اسی لیے نظم کی تفہیم و تحسین کے سلسلے میں نظم کے ساتھ، اور نتیجۃً شاعر کے ساتھ نادانستہ طور پر بے انصافی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اختر حسین جعفری کو اس امر پر ہمیشہ اصرار رہا کہ نظم کو ایک اکائی کی صورت میں پرکھا جانا چاہیے۔ ہر نظم کا ایک مجموعی تاثر ہوتا ہے، ایک Cowbac; ردِعمل ہوتا ہے۔ اگر نظم کی لائن کمزور ہے تو وہ یقیناً نظم کے مجموعی تاثر کو ناگوار انداز میں متاثر کرے گی، مگر نظم کے مصرع بہ مصرع جائزے کو نظم کی تنقید کا معیار نہیں بنانا چاہیے۔ ن۔م راشد ہوں، میراجی ہوں، مجید امجد ہوں، ظہور نظر ہوں یا اختر حسین جعفری ہوں، سبھی صحیح اور جائز تنقید سے محروم رہے ہیں۔ راشد کو جدید فارسی لفظیات کو اپنے کلام میں سلیقے سے کھپانے کی داد دی جاتی ہے، میراجی کا ہندی شاعری سے اثر پذیری کا اعلان کیا جاتا ہے، مجید امجد کو داد دی جاتی ہے کہ وہ نظم کی ہیئت کے معاملے میں ہمیشہ ایک مثبت اضطراب میں رہا اور اسی لیے آخر تک تجربے کرتا رہا۔ ظہور نظر کی تحسین ہوئی تو صرف اس حد تک کہ وہ قافیے سے بدکتا نہیں تھا بلکہ نظمِ آزاد میں بھی حسبِ موقع قافیے کی موسیقی سے کام لینا جانتا تھا۔ اختر حسین جعفری کی نظم میں مواد، موضوع اور ہیئت کی محض Perfection کا اعتراف کیا جاتا ہے اور یوں ان پانچوں معتبر نظم نگاروں کی تحسین کا باب ختم کر دیا جاتا ہے۔

اب ہمیں اس دور کے بہت ہی بڑے نظم نگار اختر حسین جعفری کے بارے میں حتمی طور پر طے کر لینا چاہیے کہ ہمیں اس بے مثال شاعر کو ٹکڑوں میں بانٹنے کے بجائے، اس کی ہر نظم کے مجموعی تاثر کو سمیٹنا ہوگا اور اس کے ہاں علامت نے جو طلسم کاری کی ہے اور اسلامی تاریخ کے حوالوں نے استعاروں کی صورت میں اس کے فن کو جس طرح جگمگایا ہے اور جس انتہائی حد تک اس نے اردو شاعری کی روایات کو جانچا، پرکھا اور برتا ہے —— اور اس سب کچھ کے علاوہ جعفری نے اردو نظم کے آفاق کو جہاں تک پھیلایا اور پہنچایا ہے اور آئندہ کے نظم نگاروں کے لیے اس کی شاعری نے جن جہات کی نشان دہی کی ہے اور جن بے پناہ امکانات کو بے نقاب کیا ہے، انھیں جعفری کے فن کی تنقید کے دائرے میں لانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کام ہماری نئی نسل کے پڑھے لکھے نقادوں کا ہے۔ ہم شاعر لوگ تو صرف تاثراتی تنقید کر سکتے ہیں۔ اصل کام تو ان نوجوان نقادوں کا ہے جنھیں ماضی اور حال کے نقادوں کی کوتاہیوں سے دامن بچا کر اردو میں صحیح، سچی، کھری اور متوازن تنقید کی نئی روایت قائم کرنا ہوگی —— اختر حسین جعفری فنِ شاعری کی ایک متاعِ بے بہا ہے۔ ہمیں طے کر لینا چاہیے کہ ہم کسی بھی قیمت پر اس کے فن کے ساتھ بدسلوکی نہیں ہونے دیں گے اور اس کے فن کو اسی روشنی میں پرکھیں گے جو اس کے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ میں سے امڈی پڑ رہی ہے۔ رہیں اس کی شخصی مجبوریاں، تو وہ ہم سبھی پر چھائی رہی ہیں اور ہم سب کا فرض ہے کہ آنے والی نسلوں کو بتائیں کہ بیسویں صدی کے آخری دہے میں ایک کتنا بڑا انسان ہم سے یکایک جدا ہو گیا تھا۔ اور اس کی بڑائی کی کتنی بے شمار پرتیں تھیں اور اس کی شخصیت اور اس کی شاعری یوں باہم آمیختہ تھیں کہ وہ گھر میں تھا یا دفتر میں یا محفلِ احباب میں، وہ مجسّم شاعری ہوتا تھا۔ یوں سمجھیے کہ وہ فنِ شاعری کی تجسیم تھا۔ اس کی رخصت پر میاں محمد بخش رح کا یہ مصرع، جو جعفری نے انتقال سے چند ہی روز پہلے مجھے سنایا تھا، دُہرانے کو جی چاہتا ہے:

پائی لیر پرانی دانگوں سُنگ گیوں وِنج کگراں!

"جسم اُترا ہے کس منزلِ عمر سے" (اختر حسین جعفری کا سوانحی خاکہ)

یوسف حسن

(یہ سوانحی خاکہ صرف انہی معلومات پر مشتمل ہے جو اختر حسین جعفری مرحوم نے ۱۳ دسمبر ۱۹۹۱ء کی رات کو عامر ہوٹل لوئر مال لاہور میں ایک نشست میں راقم کے سوالوں کے جواب میں مہیا کی تھیں۔ ی۔ ح)

اختر حسین جعفری ۱۵، اگست ۱۹۲۲ء کو موضع بی بی پنڈوری تحصیل و ضلع ہوشیار پور (پنجاب، بھارت) میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد محمد علی محکمہ مال میں گرداور قانون گو کی حیثیت سے متعین تھے۔ انہوں نے پرائمری سکول موضع سرسولی تحصیل و ضلع ہوشیار پور میں درجہ چہارم تک تعلیم حاصل کی اور درجہ چہارم کا وظیفے کا امتحان پاس کیا۔ جب وہ درجہ چہارم میں زیرِ تعلیم تھے تو اسی دوران ۱۹۴۱ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا لہٰذا وہ درجہ چہارم کا امتحان پاس کر کے اپنے دادا شاہ محمد کے پاس بگرات (پنجاب، پاکستان) چلے آئے۔ اُن کے دادا بگرات میں کسی کی اراضی کے مختارِ عام تھے۔

اختر حسین جعفری نے پانچویں سے لے کر دسویں جماعت تک سناتن دھرم ہائی سکول جی ٹی روڈ بگرات (اسی سکول کی عمارت میں اب زمیندارہ سائنس کالج قائم ہے) میں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

آزادی کے بعد ان کے والد گوجرانوالہ آ گئے اور اندرون کھیہاڑی گیٹ گوجرانوالہ میں مکان الاٹ کرایا مگر اختر حسین جعفری بگرات ہی میں مزید تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں زمیندارہ کالج بگرات سے انٹر کا امتحان پاس کیا اور پھر اسی کالج میں بی اے میں داخلہ لیا۔

۱۹۴۹ء میں لاہور میں کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے انعقاد کے بعد اسی سال بگرات میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہوئی۔ صفدر میر اس کے کنوینئر تھے۔ بانی ارکان میں صفدر میر کے علاوہ شریف کنجاہی، قربان طاہر، اختر حسین جعفری اور راجا نثار شامل تھے۔ اختر حسین جعفری کو اس شاخ کا سیکرٹری بنایا گیا جبکہ مجلسِ عاملہ میں صفدر میر، شریف کنجاہی اور محمد عارف (پبلک پراسیکیوٹر) تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے پندرہ روزہ تنقیدی اجلاس قربان طاہر کے گھر (شفاخانہ حیوانات والی گلی) میں منعقد ہوتے تھے۔ انجمن نے جلال پور جٹاں میں خاکروبوں اور بگرات میں تانگہ بانوں کی ہڑتال بھی کرائی۔ اختر حسین جعفری نے بتایا کہ "۱۹۵۰ء میں ترقی پسند سرگرمیوں کی وجہ سے مجھے زمیندارہ کالج بگرات سے نکال دیا گیا۔ اس وقت میں سال سوم کا طالب علم تھا۔ اس کے بعد میں گوجرانوالہ آ گیا۔"

صفدر میر جو زمیندارہ کالج بگرات میں اُستاد تھے، اُنہیں بھی اسی بنیاد پر کالج سے فارغ کر دیا گیا۔ اس کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین بگرات معطل ہو کر رہ گئی۔

بگرات سے نکلنے کے بعد اختر حسین جعفری نے اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں داخلہ لیا۔ نیز گوجرانوالہ، بگرات اور سیالکوٹ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخیں منظم کرنے کے لیے کنوینئر مقرر ہوئے۔ ان کے زیرِ نگرانی گوجرانوالہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ ۱۹۵۰ء میں قائم

ہوئی جس کے سیکرٹری جاوید شاہین تھے جبکہ غلام نبی بھٹہ اور راؤ منظور شاہد بھی عہدیدار تھے۔ اس شاخ کے ہفت روزہ اجلاس وائیٹ ہاؤس ہوٹل جی ٹی روڈ گوجرانوالہ میں منعقد ہوتے تھے۔

گوجرانوالہ میں قیام کے دوران اختر حسین جعفری کے دفعہ ۲ کے وارنٹ بھی نکلے۔ ان پر یہ الزام تھا کہ سجاد ظہیر ان کے پاس ایک رات ٹھہرے ہیں۔ سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور جنرل اکبر کی گرفتاری کے بعد جب بعض ترقی پسند کارکن نظر بند کر دیئے گئے اور بعض زیر زمین چلے گئے تو اختر حسین جعفری بھی جہلم شہر میں روپوش رہے۔ آخر ان کے والد کے اثر سے نواب زادہ سجاد علی خان کی کوشش سے وارنٹ واپس لیے گئے۔

۱۹۵۱ء میں اختر حسین جعفری بی اے کا امتحان دے کر لاہور آ گئے۔

۱۹۵۲ء میں انہوں نے آرمی گیشن سیکرٹریٹ لاہور میں لوئر ڈویژن کلرک کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔ ۱۹۵۳ء میں محکمہ کسٹم اینڈ ایکسائز لاہور میں انسپکٹر کی حیثیت سے بھرتی ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں اسی محکمے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر ترقی پا کر کراچی گئے اور سال بھر وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد:

۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۹ء راولپنڈی میں رہے۔

۱۹۷۹ء تا ۱۹۹۰ء لاہور اور گوجرانوالہ میں رہے۔

۱۹۸۱ء میں ان کا شعری مجموعہ "آئینہ خانہ" شائع ہوا۔

اس کی دوسری اشاعت ۱۹۸۸ء میں ہوئی۔

۱۹۹۰ء میں مختصر عرصے کے لیے پھر راولپنڈی آئے۔

۱۹۹۱ء میں لاہور چلے گئے۔

اُن کی شادی ۱۹۶۳ء میں ہوئی تھی۔

اولاد: ۱۔ منظر حسین اختر (بیٹا)

۲۔ نومولود کا انتقال ہو گیا (بیٹا)

۳۔ سعیدہ اختر (بیٹی)

۴۔ امیر حسین (بیٹا)

۵۔ شروت اختر (بیٹی)

۶۔ سعدیہ اختر (بیٹی)

زیر ترتیب مجموعۂ کلام "اداس کہسار کے نوحے"

وفات۔ لاہور۔ ۳ جون ۱۹۹۲ء

تدفین۔ لاہور۔ ۴ جون ۱۹۹۲ء

وہ جس کے ذکر سے خالی بھرا ہُوا اخبار

آفتاب اقبال شمیم

یہ ایک اہم شام ہے۔ یہ شام اس لئے اہم ہے کہ ہم یہاں پر اُس اختر حسین جعفری پر گفتگو کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں جس کے بارے میں مکی ذرائع ابلاغ نے ہمیں باور کرایا ہے کہ وہ ایک غیر اہم شاعر تھے۔ کچھ عرصہ پہلے عزیز حامد مدنی کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا تھا۔ میں اپنی گفتگو کا آغاز اختر حسین جعفری کی طویل نظم آئینہ خانہ کے چار مصرعوں سے کرتا ہوں:

اسی کی نذر قلم، حاشیے، سیاق و سباق
وہ جس کے ذکر سے خالی بھرا ہوا اخبار
اسی کی نذر رُکی آب جو، تہی دریا
جہاں طیور کو آبِ وضو نہیں ملتا

اور وہ غیر اہم شاعر اختر حسین جعفری اسی رُکی ہوئی آب جو اور تہی دریا کے کنارے سے پیاسا اُٹھ کر چپ چاپ گزر گیا ہے۔ اور چند ہی روز پہلے اُس کے ذکر سے خالی، بھرا ہوا اخبار بھی ہماری نظروں سے گزرا ہے۔ اس کی موت کی اطلاع مجھے افتخار عارف کے تعزیتی بیان اور لاہور سے آصف ہمایوں کے دیر سے پہنچنے والے خط سے ملی۔ نہ اس کے جانے کی خبر سے سماعت کا کوئی دالان گونجا، نہ صبح کے نامہ برکی چشمِ بے نیاز میں کوئی اشک نما لفظ ڈھلکا ہوا نظر آیا۔ اور آتا بھی کیوں کہ ہماری معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی صورت ہی دگرگوں ہو چکی ہے۔ یہ صورتِ حال کسی غفلت، لاپروائی یا بے حسی کا نتیجہ نہیں بلکہ ہوا یہ ہے کہ ہمارے ذہنی تحفظات، اور قومی اہداف کی نوعیت ہی یکسر بدل گئی ہے۔ اب تو نامہری اسی کو ملے گی جو کسی پھلتی پھولتی صنعت سے تعلق رکھتا ہو۔ خواہ وہ اخباری صنعت ہو یا تار و پودِ خوشامد سے برہنگی کے ملبوسات بننے کی صنعت۔ اب تو شہرت اسے ملے گی جو گلیمر سے عشرتِ حواسِ خمسہ کا سرسری بندوبست کیا کرے گا۔ خواہ کھیل کود کے میدان میں یا شوبزنس کی شب نواز دنیا میں۔ یہ مہاجنوں اور وظیفہ خواروں اور شعبدہ گروں کا دور ہے۔ اے اختر حسین جعفری! تم ہو کون؟ —— ایک سچے اور بڑے شاعر ہو تو پھر کیا! کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے، کسی کھیل کے کپتان ہوتے! پھر جتنے اچھے شاعر ہو اتنے اچھے کمپیئر ہی ہوتے۔ پھر تمہاری موت کی خبر کسی مقامی اخبار کے ساتویں صفحے کے ساتویں کالم میں نہ لگتی۔ بلکہ تمہارے جنازے میں اعلیٰ حضرت اور ولی عہد بھی شامل ہوتے۔ سب کالم نویسوں (ظفر اقبال کمیت) کے قلم کی سیاہ روشنائی سے سرخ لفظ پھوٹتے۔ لیکن حیف کہ تم اختر حسین جعفری ہو۔ تمہارا شعبہ صنعت کا درجہ نہیں رکھتا۔ سو تمہارے ساتھ جو ہوا اسے بھگتو۔ ہماری باری آئی تو ہم بھی بھگت لیں گے —— یہ بات تو طے شدہ ہے کہ ادب شے پرستوں اور دنیا داروں کے لئے کارِ فضول ہے۔ اختر حسین جعفری کا شعر اُن کی فریکوئنسی پر کیچ ہی نہیں ہو سکتا۔ پس شکایت کرنا بے سود ہے۔ اُن سے صرف یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ تھوڑا سا سر کھپانے کا موقع نکالیں اور یہ سوچیں کہ اگر دنیا کی تہذیبی تگ و دو سے رفتہ و موجود تمام شاعروں اور ادیبوں کو نکال دیا جائے تو باقی کیا بچے گا۔ وہ انسانی باطن کی تہذیب اور خیر کے عمل کو آگے بڑھانے کے لئے زندگی کے بھیجے ہوئے مندوب اور کارکن ہیں۔ اُنہیں سچ بولنے سے کوئی دروغ، کوئی جبر باز نہیں رکھ سکتا۔ اب اختر حسین

کرنے والا اتنا ہی گہرا خواب دیکھے گا۔ یہ زندگی کی قوتِ نمو کا فیصلہ ہے کہ اختر حسین جعفری نام بدل بدل کر آتا ہی رہے گا اور سچ بولتا ہی رہے گا۔

اب آگے چلتا ہوں اور اختر حسین جعفری کی شاعری کے بارے میں بات کرتا ہوں۔ یہ شاعری اپنے موضوع کے اعتبار سے ہمارے عصر پر مرکوز ہے اور اپنے نقطۂ نظر میں ایک روشن خیال، ترقی پسند اور انسان پرست ذہن کی غماز ہے جو خارج اور باطن میں بڑھتے ہوئے فاصلوں کی خبر رکھتا ہے اور وجودی سطح پر اپنی زمین، اپنے عصر، اور حق و صداقت سے وفا کا عہد استوار کر چکا ہے۔ وہ اپنی دردآشنائی کے توسط سے انسانی صورتِ حال کے انحطاط اور سال بہ سال روبہ زوال ہوتے ہوئے گرد و پیش کی خبر رکھنے اور خبر دینے پر مامور ہے۔ نظم "عاشور" ایک باکمال شاعر اور مصور کی ایسی ہی تخلیق ہے جو ایک تاراج ہوتے ہوئے منظر کی تصویر کشی کرتی ہے۔ اس نظم کا آغاز کیسی اچھوتی تمثال، کیسی معنی خیز تمثیل اور کتنے اچانک پن سے ہوتا ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجیے:

ہوا نے اس سال جتنے عمّال دوسری شاہیوں کو بھیجے تھے
ان کے اسناد میں عبارت کی غلطیاں تھیں
زمیں نے اس سال جتنی گندم اُگائی تھی اس میں سنگریزے تھے
خوانِ محنت پہ نانِ تازہ سے بوئے کشتِ فساد آئی

جمود و جبر کے اسی طرح کے بلیغ اشارے اختر حسین جعفری کی نظموں میں جا بجا بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ مثلاً:

پڑا تھا خشک لہو کا اناج منبر پر
زمیں جس کی دیت قبول کرتی نہ تھی

موضوع کے اعتبار سے 'آئینہ خانہ' ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ سے مماثل نظر آتی ہے۔ 'آئینہ خانہ' ایک مشرقی خرابے کا منظر پیش کرتی ہے جس میں a heap of broken images کی جگہ a medley of over-lapping images نے لی ہے۔ جو آئینہ خانہ کا اپنا وصف بھی ہے جس میں عکس در عکس شکلیں اور منظر اُبھرتے چلے آتے ہیں۔ ان دونوں مماثل نظموں کا پس منظر، ٹریٹمنٹ اور اسلوب بہر طور بالکل مختلف ہے۔

اختر حسین جعفری بہت سنجیدہ شاعر ہے جس نے صرف منتخب شاعری کی ہے۔ کسی نظم میں کوئی لائن موضوع سے باہر نکلی ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔ یہ اُس کے جدید ہونے کی دلیل بھی ہے اور اپنی شاعری کے ساتھ کومٹمنٹ کا ثبوت بھی، اور ساتھ ہی اپنی شاعری کے سخت گیر نقاد ہونے کا اظہار بھی۔ یہ امتیاز آج کی شاعری میں اختر حسین جعفری کے سوا کسی شاعر کو حاصل نہیں۔

فنی اعتبار سے اختر حسین جعفری لسانی تشکیلات کے حلقۂ شعرا سے کہیں زیادہ خود منظم شدہ self-disciplined ہے۔ وہ مغرب کے جدید علامت نگاروں اور تمثالیوں کے زیرِ اثر تلمیح، علامت، استعارے، تلازمے، تمثال اور جدید زمانی تصور سے ایک نیا شعری محاورہ ترتیب دیتا ہے جس پر ہمارے احباب دبی زبان میں ابہام کا لیبل چسپاں کر دیتے ہیں۔ لیکن اصل میں یہ ہیئت کا ایک نیا تجربہ ہے جو ادب کی عالمی روایت سے منسلک ہے۔ اب ہم جو اپنی تین چار صد سالہ ادبی روایت کے آنگن سے باہر نکلنے کے لئے تیار نہیں اور اسی آنگن میں شاعری کی چابی والی موٹر گھماتے رہتے ہیں، اس ہیئت کو کیسے قبول کریں گے جسے اختر حسین جعفری یا پھر احمد تسیم نے برتا ہے۔

اختر حسین جعفری کے ڈکشن پر بھی چھاپ بڑی گہری ہے۔ لیکن ترکیب سازی میں طباعی اور خلاقی کا کرشمہ جو ہمیں اُس کے ہاں نظر آتا ہے اور جس طرح وہ زورِ ترکیب اور پُرکاریِ ہنر سے احساس کو رسائی کے دور دراز منطقوں تک لے جاتا ہے اُس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اُس نے اپنے معجزۂ تخلیق سے ہر لفظ کو علامت بنا دیا ہے، جو لفظ کو موجود کی عمل داری سے باہر لے جا کر نئی جہتیں دریافت کرتی ہے اور اُسے نئے معنی سونپتی

ہے۔ ہر منظر آج کا منظر ہے اور آج سے ماورا بھی۔ علامت معنی کو وسیع تر تو کرتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یوں بھی لگتا ہے جیسے یہ ساری نظمیں ایک ہی جڑ سے پھوٹے ہوئے پودے ہیں۔ اور یہ اصل وہ ولایت خاص ہے جس کے کچھ نخیل اُدھر قبیلۂ براہیم تک اور اِدھر آلِ رسولؐ تک پھیلے ہوتے ہیں۔ اور اسی منظر نامے میں اختر حسین جعفری کی نظم کو اپنے معنی کا جواز اور اپنے وجود کا حوالہ ملتا ہے۔

آخر میں یہ تین مصرعے پڑھ کر آپ سے اجازت چاہوں گا، جو اختر حسین جعفری نے ایذرا پاؤنڈ کی موت پر لکھے تھے ؎

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں
تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی تھے

(یہ مضمون اختر حسین جعفری کی یاد میں ایک جلسے میں پڑھا گیا)

آدم جی ادبی انعام یافتہ
اُردو نظم کے دورِ رواں کا شہ پارہ
آئینہ خانہ
مصنف: اختر حسین جعفری
دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے
بلیغ رنگین گرد پوش
قیمت ۵۰ روپے
مطبوعات ۶/اے نسبت روڈ - لاہور

ناصر کاظمی کی شخصیت اور شاعری پر لکھی جانے والی پہلی کتاب
ناصر کاظمی ــــــ شخصیت اور فن
مُصنّفہ: ناہید قاسمی
قیمت: ۸۵ روپے
یہ کتاب دورِ حاضر کے اس بڑے غزل گو کے فن کا بھرپور محاکمہ ہے
ناشر: فضلِ حق اینڈ سنز، پبلشرز، دربار مارکٹ، لاہور

اختر حسین جعفری — میرا دوست

ضیاء الدین ضیاء

اگر یہ طے ہے کہ انسانی شخصیت کی تعمیر اور تشکیل میں اس کا ماحول اور معاشرتی عوامل بنیادی کردار ادا کرتے ہیں تو پھر اختر حسین جعفری جیسے بڑے، سچے اور کھرے شاعر اس ملک میں پیدا ہونے سے رہے۔ ہم جس گمراہی کی جانب رواں ہیں اور ملک کو جس نہج پر چلایا جا رہا ہے اس کے پیشِ نظر اس سلسلے میں کسی خوش گمانی کی گنجائش نہیں۔ شاعر کا کام تو سچائی کی تلاش، حسن کی تخلیق اور دوسروں تک اس کا ابلاغ ہے۔ وہ تو اخلاص و محبت اور مہر و وفا کا درس دیتا اور لوگوں میں پیار بانٹتا ہے۔ تو کیا ایسا معاشرہ جس میں بدامنی، باہمی منافرت، مفاد پرستی، کذب و ریا کا دور دورہ ہو وہ جعفری ایسے درویش صفت اور پیارے انسان کو جنم دے سکتا ہے؟ یہ موضوع بجائے خود نہایت اہم اور ہم سب کی توجہ کا طالب ہے البتہ فی الوقت تو مجھے اپنے دوست اختر حسین جعفری کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

اختر حسین جعفری بلاشبہ اس عہد میں اردو شاعری کی ایک بلند قامت اور گراں قدر شخصیت تھی۔ اس کی رحلت سے ملک یقیناً ایک نامور صاحبِ قلم سے محروم ہو گیا ہے۔ موت کے ساتھ اس معرکہ میں اردو ادب اور جدید نظم کا جو زیاں ہوا اس کی تلافی تو شاید مدتوں ممکن نہ ہو لیکن میں بھی اس حادثے میں بہت کچھ گنوا بیٹھا ہوں۔ اردو ادب کو آج جس خسارے کا سامنا ہے وہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے لیکن اس کے ساتھ اگر میں اپنی ذاتی محرومی کا حساب کروں تو آپ شاید میرے دکھ کا ٹھیک طور سے اندازہ نہ کر سکیں تاہم اپنی غرضِ صحت اور ملکی حالات کو دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنے دوست کی محرومی کا دکھ مجھے کچھ زیادہ عرصہ نہیں اٹھانا ہوگا۔ ایک بہت ہی حسبِ حال شعر یاد آ رہا ہے:

کاروان سحر ام اندوہ و اماندن کراست ہر کہ پس ماند دم دیگر مقدم می شود

اختر حسین جعفری کی ادبی حیثیت کا تعین، اس کی تخلیقات پر نقد و نظر، اور اس کے کلام کے محاسن و معائب کی نشاندہی تو آپ کی ذمہ داری ہے اور یا پھر آنے والے عہد کی ذمہ داری، البتہ اپنے محدود مطالعہ کی بدولت اور ایسے ہی چند ایک احباب کی رفاقت کے فیض سے میں نے جو کچھ سیکھا اور جانا ہے اس کی بنا پر میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اختر حسین جعفری ایک عظیم، منفرد اور صاحبِ اسلوب شاعر تھا۔ جدید نظم میں اس نے جس اسلوب کی بنا ڈالی اردو شاعری میں اس سے پہلے اس کی مثال موجود نہیں۔ اس کی شاعرانہ عظمت پر حرف گیری کرنے والے تو شاید مل جائیں لیکن اس حقیقت سے اس کے معترضین بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اپنے رنگِ سخن اور طرزِ اظہار میں وہ یکتا اور یگانہ ہے۔

روایت کے دلدادہ اور عروسِ شعر کو مخصوص ملبوسات میں دیکھنے کے آرزومند اہلِ ذوق حضرات کو جدید نظم کے فہم و ادراک میں ہمیشہ سے دشواری کا سامنا رہا ہے اور ان کی یہ معذوری ہے بھی درست۔ شاعر اگر اپنے خیال کو قابلِ فہم انداز میں دوسروں تک پہنچانے سے قاصر ہے اور تفہیم و تحسینِ شعر کی منزل قاری کو اپنے ہی فکر و تخیل اور ظرف کے مطابق خود ہی طے کرنی ہے تو پھر شاعر سے زیادہ قاری داد کا مستحق ٹھہرتا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اختر حسین جعفری نے یہ مرحلہ انتہائی سلامت روی سے طے کیا ہے اور اپنی شاعری کے دامن کو ابہام سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ "آئینہ خانہ" کی چند ایک ابتدائی نظموں سے قطع نظر جن کے بارے میں اسے بجائے خود احساس و اعتراف تھا، اس کی تمام شاعری اس قباحت

سے پاک ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس کے کلام پر کسی رائے کا اظہار میرا منصب نہیں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں وہ دلنواز، ہنس مکھ لیکن اندر سے حزیں اور دلزدہ شخص میرے عزیز ترین دوستوں میں سے تھا۔ وہ نرم خو، خوش گفتار اور شائستہ اطوار کا مالک تھا۔ ہم نے بہم ایک دوسرے کو چاہا۔ وہ بطور شاعر بھی میرا محبوب تھا اور بطور انسان بھی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بھی مجھے بہت عزیز جانتا اور بے حد عزیز رکھتا تھا۔ اپنے ہر دوست کے سامنے میرے بارے میں اپنے محبت بھرے جذبات کے اظہار کا کوئی نہ کوئی موقع تلاش کر لیا کرتا۔ اس کے ساتھ وابستگی اور الفت و یگانگت کا یہ رشتہ میرے لئے زندگی بھر کا اعزاز تو ہے ہی، ساتھ ہی آپ میں سے بہت سے احباب کے ساتھ تعارف اور تعلق کی سعادت بھی مجھے اسی کے حوالے سے ملی۔

غالباً ۱۹۸۵ء کا ذکر ہے۔ میں ان دنوں لندن میں تھا جہاں اپنے دیرینہ اور عزیز دوست اور اردو کے ایک اور بڑے اور بلند مرتبہ شاعر احمد فراز کی معیت میں محترم افتخار عارف کے ساتھ، جو اُن دنوں 'اردو مرکز' لندن کے نگرانِ اعلیٰ تھے اور آجکل اکادمی ادبیات پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل ہیں، اکثر ملاقات رہتی۔ انہوں نے اختر حسین جعفری کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا "جعفری یقیناً ایک منفرد اسلوب کا شاعر ہے لیکن وہ اپنی نظم کے ہر مصرع کی تراش خراش میں بڑی کاوش کا مظاہرہ کرتا ہے اور اس سلسلے میں بہت حساس واقع ہوا ہے"۔ میں نے عرض کی "مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہے لیکن میرے نزدیک یہ کوئی ناپسندیدہ بات نہیں"۔ اور آج میں سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اپنے ذہن کے کسی گوشے میں کوئی بیوٹی سنٹر بھی کھول رکھا تھا جہاں وہ نگارِ فن کی رونمائی سے پہلے کمال مہارت سے تزئین و آرائش کرتا اور اس نازنین کے حسن و جمال کو زیادہ پُرکشش بنانے کے لئے کچھ ایسا گھونگھٹ کاڑھتا کہ اس کا رُخِ زیبا کچھ اور پُرفسوں، کچھ اور دلفریب ہو جاتا۔ اس کے شعر میں جو تاثیر اور دلکشی ہے وہ محض صنعت گری، پُرکاری یا کرافٹ کا کمال نہیں۔ آپ اس کی شاعری کا مطالعہ کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ اس کی ناراضی اور احتجاج میں بھی ایک دُکھ اور حزن و ملال کی کیفیت ہے۔ اگر اس کی ہنرمندی میں اس کے دردمند دل کا گداز شامل نہ ہوتا تو وہ ایسی پُراثر شاعری نہ کر سکتا۔ بیدلؔ نے کیا خوب کہا ہے:

غازۂ حُسنِ ادا آساں نمی آید بدست　　فکر خونہا می خورد تا رنگ می گردد سخن

اختر حسین جعفری ایسے حساس آدمی کو دل کی بیماری نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔ تعجب ہے کہ ایسے دھان پان آدمی کو بلڈ پریشر اور دل کی بیماری لاحق ہو، جسے وہ ہمیشہ احباب سے چھپانے کی کوشش محض اس لئے کرتا کہ مبادا وہ رنجیدہ ہوں اور انہیں کوئی تشویش ہو۔ ملکی حالات کی روز افزوں ابتری اور بگاڑ نے اس کی صحت پر بہت اثر ڈالا اور یوں وہ اپنی منزل کے قریب تر ہوتا گیا۔

اسے اپنے ملک سے بے پناہ محبت تھی۔ اس کے مستقبل کے بارے میں اپنی تشویش کو اس نے اپنی بہت سی نظموں کا موضوع بنایا۔ ملک سے اپنے عشق اور کومٹمنٹ کے متعلق اس کا یہ شعر تو آپ نے پڑھا ہوگا: میں اسے یہاں دہرانا چاہتا ہوں:

سر و تا خاکِ گہہ اپنی وفا کا سلسلہ　　سر کشیدہ اُس کی خاطر، پائمال اُس کے لیے

اور یہ واقعہ ہے کہ جبر کے تاریک عہد میں اس نے کسی مصلحت یا کسی خوف کے تحت حق بات سے گریز نہ کیا اور سربلند رہا۔

جب پہلی مرتبہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا تو منظرؔ[1] نے مجھے باخبر کیا۔ میں نے اُسے بذریعہ خط مطلع کیا کہ "تمہاری عیادت اور زیارت کے لئے آ رہا ہوں" دوسرے ہی روز اس نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اس نالائق نے تمہیں ناحق پریشان کیا اگر کسی کام کے سلسلے

---

[1] اختر حسین جعفری کے بڑے بیٹے۔

ہیں آ رہے ہو تو خیر ورنہ تشویش کی کوئی بات نہیں" لیکن میں جانتا تھا کہ وہ میرا منتظر ہے۔ مجھے دیکھ کر بظاہر ناراضی کا اظہار کیا لیکن اپنی آنکھوں کی نمی نہ چھپا سکا۔ دوستوں کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والا اپنے بارے میں کیسا سنگدل تھا۔

میرے ساتھ اس کے مراسم کا زمانہ کم و بیش پینتیس سال پر محیط ہے۔ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں مردان آیا جہاں میں قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک رہائش پذیر ہوں۔ پشتو زبان سے متعلق ہر باہر سے آنے والے کو جس مشکل سے دوچار ہونا پڑتا اسے بھی اس کا سامنا تھا۔ کچھ اس ضرورت کے تحت اور کچھ اپنی بے چین طبیعت کے ہاتھوں اس نے مجھے تلاش کر لیا۔ ہم جلد ہی ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔ وہ بلا کا ذہین اور تیز فہم تھا۔ اردو میں اس نے میر، غالب اور انیس کا بغور اور بھرپور مطالعہ کیا تھا۔ انگریزی میں اس کی دسترس اس کی تعلیمی استعداد سے کہیں زیادہ تھی۔ ابھی اس نے نظم گوئی میں قدم نہیں رکھا تھا اور غزل کہا کرتا تھا لیکن وہ خود بھی اپنی شاعری سے مطمئن نہ تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ روایتی اور میکینکل قسم کی غزل کہنے پر میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کی اور یوں اس صنفِ سخن سے اس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ اس دوران اس نے انگریزی شاعری کے علاوہ دیگر مغربی زبانوں کے شعرا کے تراجم پڑھ کر ان سے بھرپور استفادہ کیا اور اپنے اندر کے شاعر کو رنگا رنگ مواد فراہم کرتا رہا۔ ملازمت کے تقاضوں کے تحت مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا وہ بالآخر لاہور پہنچ گیا، لاہور جو اس کے خوابوں کا شہر تھا۔ یہاں کے شاداب ادبی ماحول نے اس کی صلاحیتوں کو صیقل کرنے اور نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہیں اس نے نظم گوئی میں کمال حاصل کیا۔ ندیم صاحب سے اسے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی اور ان کے خلاف اشارتاً بھی کوئی بات اسے بہت ناگوار گزرتی اور وہ ان کے دفاع میں ایک ارادت مند کی طرح ہمہ وقت سرگرم رہتا۔ وہ ندیم صاحب کی بحیثیت شاعر اور بطور انسان بہت سی خوبیوں کا بہ دل معترف تھا اور اپنی شاعری کے بارے میں اُن کی رائے کا اُسے بہت احترام تھا۔

مردان میں اس کا قیام تقریباً ساڑھے تین سال کے لگ بھگ تھا لیکن اس دوران ہمارے مابین جو تعلقِ خاطر قائم ہوا اس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہ پایا۔ وقت اور فاصلہ اسے کوئی گزند نہ پہنچا سکا۔ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں جہاں کہیں تبدیل ہو کر گیا اس نے ہمیشہ مجھے یاد رکھا اور میں اسے کبھی بھول نہ پایا۔ ہم ہفتے میں ایک یا دو بار ٹیلیفون کے ذریعے ایک دوسرے کی خیریت سے آگاہ رہتے۔ کوئی نظم مکمل کرتا اور اسے کسی مصرع کی صحت یا ساخت کے متعلق کوئی خلش ہوتی تو میری رائے جاننے کا منتظر رہتا۔ آخری بار غالباً انتیس مئی ۱۹۹۲ء کو اس نے مجھے ٹیلیفون کیا۔ وہ بظاہر ٹھیک اور ہشاش بشاش تھا۔ ہمیشہ کی طرح اپنی فکر چھوڑ کر مجھے صحت کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ لیکن تین جون ۱۹۹۲ء کو کچھ کہے سنے بغیر اس دارِ فانی سے رشتہ توڑ کر اور اپنے سب کام ادھورے چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ میری بدنصیبی دیکھئے کہ مجھے اس کی موت کی اطلاع بروقت نہ ہو سکی۔ میں اس کا آخری دیدار نہ کر سکا، اس کے جنازہ کو کندھا بھی نہ دے سکا۔ یہ سب کچھ ہو بھی جاتا تو کیا اس کے جانے کا دکھ کم ہو سکتا تھا؟ ہم عدم سے وجود میں آئے ہیں اور پھر ہمیں اُدھر لوٹنا ہے۔ زندگی اور موت کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا آیا ہے اور اسی طرح چلتا رہے گا۔ وہی موجِ فنا جو حباب کی طرح سطحِ آب پر نقش بناتی ہے دوسرے لمحہ اسے مٹا دیتی ہے۔ بیدل نے اس حقیقت کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

نقش نیرنگ جہاں را جز فنا نقاش نیست　　ایں بنا ہا چوں حباب از سیل پیدا می شود

اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ حباب کی یہ شکست اسے دریا کی ہستی سے ہمکنار کر دیتی ہے:

مشو غافل ز رمزِ ہستی من　　شکستِ ایں حباب آغوشِ دریاست

اس مضمون کا احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر بھی بہت خوبصورت اور قابلِ ذکر ہے اور میں اس کے ساتھ آپ سے اجازت چاہوں گا:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا　　میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

اختر حسین جعفری اب اس بحرِ بے کنار میں اتر گیا ہے۔ خدا اسے مغفرت کرے۔

ضیاء الدین ضیاء

اپنے دوست اختر حسین جعفری کیلئے چند شعر

دل درد سے ہے فگار اپنا تاراج ہوا دیار اپنا
رخصت ہوا یارِ غار اپنا اب ہم کو ہے انتظار اپنا

وہ نقش گرِ جمالِ فن تھا اور معتبر اس کا ہر سخن تھا
وہ شاہدِ بزمِ حرف و معنی اک پھول کہ زینتِ چمن تھا

گہرے تھے شبِ ستم کے سائے ہر گام پہ یار ڈگمگائے
اندازِ جنوں بدل گیا تھا دیوانہ پھرے تھا سائے سائے

ہمساز خموش، ہمنوا چُپ احباب وعدو گریز پا چُپ
تھا نغمہ گری کا اس کو آزار اس عہد میں وہ نہ رہ سکا چُپ

نادان نہ تھا کہ لب کشا تھا وہ خوئے ستم سے آشنا تھا
جو بات تھی، واشگاف اُسکی اور جو بھی سخن تھا، برملا تھا

حرفوں کے سدا چراغ روشن منزل کا رہے سراغ روشن
اس نے جو ہمیں عطا کئے ہیں دائم وہ رہیں گے داغ روشن

قتیل شفائی

مملکتِ نظم کا والی

نظم کہنے کی تمنّا تو بہت ہے مجھ کو
میں کئی دن سے کوئی نظم نہیں کہہ پایا
سامنے میز پہ رکھے ہوئے قرطاس و قلم پوچھتے ہیں
"اس قدر بانجھ خیالات ترے کیسے ہوئے؟
لا اِدھر ہاتھ بڑھا
ہم ترے احساس کو تخلیق پہ مائل کر دیں"
بات تو ٹھیک ہے
لیکن مرے قرطاس و قلم کو نہیں شاید معلوم
آج کی رات کسی معجزۂ فن کی توقع ہے عبث
آج کی رات کوئی نظم نہ ہو پائے گی
نظم تو نظم کسی مصرعِ تر کا بھی نہیں ہے امکاں
(خشک ہونے کو کہاں ہے تنِ شاعر میں لہو؟)
آج کی رات ہے خود محوِ فغاں اُس کے لئے
مملکتِ نظم کا جو والی تھا
نظم کہنے کا حقیقت میں سلیقہ تھا جسے
آج کی رات اگر میں نے کوئی نظم کہی
مسکراتا ہوا وہ سامنے آجائے گا
اور محبت سے کہے گا مجھ سے

"نظم کہنے کا تکلّف نہ کر اے دوست مرے
تُو غزل گو ہے، کوئی تازہ غزل مجھ کو سُنا
ہر غزل تیری پسند آتی رہی ہے مجھ کو
اور پھر آج ـــــ بچھڑ کر تجھ سے
لازماً تجھ کو غزل کہنا ہے میں جانتا ہوں
(ہجر کا درد رچا ہو جس میں)
لا کوئی تازہ غزل کہہ کے سُنا دے مجھ کو
اسی انداز سے کر مجھ کو مخاطب جیسے
یاد کرتا ہے سدا تُو کسی بچھڑے ہوئے ہمراہی کو
تُو نے اک شعر بھی ایسا جو مرے نام کیا
مری جنّت کے در و بام نکھر جائیں گے
تیرے غم سے مرے سینے میں جل اُٹھیں گے چراغ
تیرے آنسو مری پلکوں پہ بکھر جائیں گے
اور پھر تجھ سے میں اک نظم کہلواؤں گا ایسی مرے دوست!
جو فرشتے بھی نہیں کہہ سکتے
جس کے سُننے کو زمیں پر مرا فردوس اُتر آئے گا
"جعفری جعفری!" کہتے ہوئے تُو مجھ سے لپٹ جائے گا۔!"

توصیف تبسّم

اختر حسین جعفری کیلئے ایک نظم

اگر وہ شخص یاں ہوتا
تو اپنا مرثیہ لکھتا
وہ جس کا دستِ سینہ کوب
بے چہرہ دنوں کے حلقۂ ماتم میں رہتا تھا
وہ جس کے چاک پر
سب لفظ نم آلود مٹّی کی طرح
اُس کی ہُنر ور انگلیوں کے لمس سے
بنتے، سنورتے تھے
اُسے ضد تھی
کہ حدِّ آسماں سے اُس طرف دیکھے
سو وہ رخصت ہوا
چُپکے سے اک روشن ستارے کی رفاقت میں
کہ وہ خود بھی ستارہ تھا!

خورشید رضوی

ستارے کا نوحہ

ابھی ملا تھا
ابھی ملی ہے خبر
کہ وہ اب نہ مل سکے گا

بس ایک پل میں فراق کی دُھند
جَم کے پتھر میں ڈھل گئی ہے
نہ جانے یہ نزدو دُور کیا ہے
یہ رمزِ غیب و حضور کیا ہے
وہ اخترِ تابناک جو کل
ہمارے اپنے مدار میں تھا
وہ اب کئی سالِ نُور پر ہے

مگر سفر روشنی کا جاری ہے
اُس نے جو شمع آنکھوں میں جلا کے رکھ دی تھی
عکس در عکس جل رہی ہے
جلی رہے گی
ہزار آنکھوں کے تِل میں ٹپکے گی قطرہ قطرہ
ہزار نسلوں کی آنکھ اُسے دیکھتی رہے گی

احمد ظفر

دریدہ دل، پریدہ رنگ

اختر حسین جعفری کیلئے ایک نظم

طلوعِ ستارہ
شبِ غم کی پہلی نشانی
غروبِ مقدر، یہ منظر
ترِ خاک مہکا ہُوا پھول رکھا ہوا ہے
بدن آئنہ تھا، مگر ریزہ ریزہ
وہ رنگِ سخن تھا
کہ تصویرِ باغِ عدن تھا
جو آنکھوں میں اترا
تو دل کے سمندر میں گم ہو گیا ہے

دیارِ مہ و مہر میں ——
—— اب نہ وہ ہے نہ میں ہوں
زمیں کے پرندے تھے دونوں
شکاری کے تیروں کی زد میں جو آئے ہوئے تھے
فلک پہ چشمِ پُرنم کی مانند بھیگا ہوا تھا
وہ کیسی فضا تھی، ہوا تھی کہ موجِ فنا تھی

میں شمعِ شبستاں بجھا دوں
سحر کے ستارے نے آواز دی ہے
یہ کارِ ازل ہے ابد کا فسانہ
وہی نقطۂ منجمد ہے زمانہ
جو آگے ہی آگے چلا جا رہا ہے
مگر حرفِ ساکت وہی ایک لمحہ
جو دستِ ستم میں تڑپتا ملا ہے

پرستش کوئی وہم ہے دوریوں کا
ستاروں کی بارش میں پھولوں کا دم توڑنا
—— یاد آیا ہے تجھ کو
اسے بھول جاؤں تو کیسے؟
تبسم جو اس نے لبوں پر سجایا ہوا تھا
غبارِ شب و روز میں کھو گیا ہے
مسافت کے گہرے کنوئیں میں اترتے ہوئے سب مسافر
دریدہ دریدہ مرا دامنِ دل
پرندے کی مانند اڑتا ہوا رنگِ محفل
مگر وہ جو مر کر بھی مرتا نہیں ہے
وہ روشن ستارہ
جو بجھ کر بھی بجھتا نہیں ہے
وہ روشن تھا —— روشن ہے ——
—— روشن رہے گا!!

گوہر ہوشیارپوری

بیادِ سیّد اختر حسین جعفری

دیوانہ بھی ، فرزانہ بھی
ایک فقیر جداگانہ بھی

زندہ خیالی کی مشعل بھی
زندہ دلی کا پروانہ بھی

اپنوں سے بھی اپنا سب کا
خود سے لیکن بیگانہ بھی

ہیئت ہیئت شعر پہ حاوی
لہجہ خاص کلیمانہ بھی

نرم ملائم بات کے اندر
گہری کاٹ حکیمانہ بھی

شعر کی دو سطروں میں مضمر
پورے بھاٹھ کا افسانہ بھی

اپنی ایک طبیعت اُس کی
دانشور بھی ، مستانہ بھی

سیّد تھا — سادات نسب تھا
سارے گن درویشانہ بھی

اپنے وقت کا لعلؓ قلندر
پروازیں شہبازانہ بھی

اپنے فن کا آئینہ گر بھی
صاحبِ "آئینہ خانہ"[1] بھی

دل زدگاں کا مرشدِ کامل
حاصل جرأتِ رندانہ بھی

نظموں کا خوش صوت مُغنّی
اک آہنگ حدی خوانہ بھی

بہرِ حسینؓ نجات ہو اُس کی
قبر میں روشن ذات ہو اُس کی

---

[1] مصنّف کا شعری مجموعہ

آئینہ خانہ

محمد سلیم الرحمٰن

کہتے ہیں کہ شراب جتنی پرانی ہو جائے اس کا ذائقہ اتنا ہی نکھر جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی سُنا گیا ہے کہ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ شاعروں کی بالغ نظری میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ میری رائے میں یہ قول صرف انہی شعراء پر صادق آسکتا ہے جو رہ رہ کر اپنی کارکردگی پر کڑی تنقیدی نظر ڈالتے رہیں اور تحسینِ ناشناس یا میٹھی چھری قسم کی ستائش کے بھانسوں میں نہ آئیں۔ ایسے شعراء کی تعداد فی زمانہ کوئی زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اور آجکل پر ہی کیا موقوف ہے، ایسے شعراء کی تعداد کسی زمانے میں بھی زیادہ نہیں رہی۔

ذرا ہٹ کر، الگ تھلگ ہو کر، اپنے لکھے کو اس طرح آنکنا جیسے وہ کسی اور کی تحریر ہو، آسان کام نہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک خاص وضع کی لاتعلقی اپنانی لازمی ہے، معروضی نقطۂ نظر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس کڑی آزمائش میں کم شاعر پورے اتر سکتے ہیں۔ لیکن ہر زمانے میں چند ایک شاعر ایسے ضرور موجود ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کمال کے جس مقام تک ان کی رسائی ہو چکی ہے وہ حقیقت میں سدِ راہ ہے، اور اگر نہیں ہے تو اسے سدِ راہ کی سنگینی میں بدلتے دیر نہیں لگے گی۔ لہٰذا بہترین حکمتِ عملی یہی ہے کہ راہ میں حائل اس دیوار کو توڑ پھوڑ کر اپنا سفر جاری رکھا جائے۔

اختر حسین جعفری کی رائے میں، جن کی نظموں کا پہلا مجموعہ "آئینہ خانہ" تین چار ماہ پہلے شائع ہوا ہے، شاعری کی غرض و غایت یہ ہے کہ اپنی شناخت کا از سرِ نو تعین کیا جائے۔ دنیا بدلتی رہتی ہے اور اس طرح آپ کی اپنی شناخت بھی تغیر آشنا ہے۔ یوں ہر نظم، بڑی حد تک، نامکمل رہ جاتی ہے۔ نظم کیا ہے گویا زینے کی سیڑھیاں ہیں جن کے ذریعے سے آپ اپنی ذات کی گہرائیوں میں اُترتے چلے جاتے ہیں، ایک ایسے مقام کی طرف بڑھتے ہیں جو سالمیت یا یکجان ہو جانے کی منزل ہے اور جہاں پہنچ کر دنیا شاید دوبارہ صحیح سالم نظر آنے لگے۔ لیکن اصل میں شاعر کو نظم کا نامکمل پن چُست رکھتا ہے۔ ہر دفعہ اسے اپنی بات نئے سرے سے شروع کرنی پڑتی ہے۔

جعفری کا مختصر پیش لفظ پڑھ کر یہ تاثر ملتا ہے کہ جس آدمی نے اسے تحریر کیا ہے وہ نثر میں اپنا مدعا بیان کرنے کا عادی نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے لکھنے والے کا سانس چڑھا ہوا ہو۔ بیانیہ میں وفور کا یہ عالم ہے کہ لفظوں کے ریلے کے سامنے خیال کے پاؤں اُکھڑ گئے ہیں۔ تاہم یہ گنجان عبارت محض لفاظی نہیں۔ جعفری نے یہاں کئی ایک پتے کی باتیں کی ہیں۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ شاعر کے پاس "ایک صحت مند انتقادی نظام عمل ہونا چاہیے" اور اسے "ہر وقت مستقبل سے متحارب صورتِ حال میں جینا چاہیے"۔ شاعر پر لازم ہے کہ ہر وقت مقابلے میں ڈٹا رہے اور مستقبل میں یا ماضی میں، کہ بات تو ایک ہی ہے، جذب ہو کر رہ جانے سے انکار کیے جائے۔ جو فنکار اس محنت شاقہ سے جی چراتا ہے اسے اپنے تخلیقی تجربات کو دہرائے جانے کی سزا ملتی ہے۔ اس کے یہ تجربات بلاشبہ ایک خاص وقت کی حد تک مستند سہی، لیکن جب ان کی جگالی پر اکتفا کر لیا جائے تو ان میں پہلی سی قوت نہیں رہتی۔ شاعر نہتا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جعفری ہتھیار پھینکنے کو تیار نہیں، بلکہ اضطراب کے عالم میں تصادم کی فضا کے دن دونی رات چوگنی ہونے کا منتظر رہتا ہے۔

جعفری نے مجھے بتایا کہ "آئینہ خانہ" کو ان کی اب تک کہی ہوئی نظموں کا مجموعہ سمجھنا درست نہ ہوگا۔ یہ اصل میں انتخاب ہے۔ خود ان کے حساب

سے مطابق غالباً چالیس نظموں کو اس انتخاب میں جگہ نہیں دی گئی۔ ان کے بقول، کوشش یہ تھی کہ نظموں کا چناؤ کسی وحدت یا ہم آہنگی کے تاثر کو ابھارے۔ چنانچہ اس کلام کو کتاب میں شامل نہیں کیا گیا جو چنی گئی نظموں کے موڈ سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ اسے ایک طرح کا معروضی رویہ سمجھ لیجیے۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ یہ کاٹ چھانٹ کرتے وقت انہوں نے بڑی بے دردی کا ثبوت دیا ہے۔ عین ممکن ہے بعض اچھی نظمیں مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئی ہوں۔

لیکن ہمیں سروکار تو اسی سے ہے جو انہوں نے باقی رکھا اور ہمارے سامنے پیش کیا۔ "آئینہ خانہ" کو تین غیر مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کا عنوان "اے میرے غم" ہے۔ اس میں سترہ ایسی نظمیں ہیں جن کی بُنت میں واضح طور پر سامنے کے واقعات اور سیاسی آثار چڑھاؤ کے رنگ نمایاں ہیں۔ اس کے بعد "آئینہ خانہ" کے عنوان سے ایک طویل نظم ہے جس کا ایک تمہیدی بند اور دو باب ہیں۔ اس میں کل ملا کر پچیس مختصر بند یا ماجرے یا غنائی اجزا ہیں۔ یہ مختصر بند یا غنائی جُز بالعموم دس مصرعوں پر مشتمل ہیں لیکن کہیں کہیں ایک مصرع کم یا زیادہ بھی ہے۔ عمومی طور پر یہ نظم خاصی پیچیدگی کی حامل ہے اور اسے شاعر کے وژن کا قلب سمجھنا چاہیے۔ تیسرے حصے میں ابتدائی کلام ہے۔ اس میں پینتیس نظمیں ہیں اور اسے "پہچان کی ابتدا" کا نام دیا گیا ہے۔

جعفری کے غیر معمولی شاعر ہونے میں شبہ نہیں۔ ان کی لفظیات نے، جو بعض اوقات فارسی تراکیب کی وجہ سے بہت بوجھل ہو جاتی ہے، کلام کو طرفگی بخشی ہے۔ نظموں پر ایسے رستے کا گمان ہوتا ہے جسے گول، چکنے سنگ ریزے جوڑ جوڑ کر بنایا گیا ہو، یعنی ہو تو رستہ لیکن اس پر چلنا تکلف سے خالی نہ ہو۔ ہو سکتا ہے ان نظموں کو پڑھ کر بعض قاری یہ سمجھ لیں کہ دیدہ و دانستہ ایک بھاری بھرکم انداز اپنا کر دوسروں سے مختلف نظر آنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان نظموں کو دیکھ کر بعض لوگوں کو ن م راشد کا خیال آئے۔

میرے خیال میں جعفری نے ن م راشد سے بہت کم استفادہ کیا ہے بلکہ شاید کہنا یہ چاہیے کہ کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ دوسری بات یہ کہ انہیں اپنے فن کا پاس ہے اور وہ کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتے کہ قارئین کو چونکا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئی سطحی قسم کا انداز اختیار کریں۔ بطور شاعر انہیں بنیادی طور پر کن باتوں سے سروکار ہے، ان کی لفظیات ایسی کیوں ہے، ان کی تمثالیں اتنی چیچپی اور کنگریلی کیوں ہیں؟ — ان سب سوالوں کا جواب ان کی ذات میں تلاش کرنا پڑے گا۔ انہوں نے کلاسیکی فارسی شاعری کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ کیا یہ مطالعہ ان کی تخلیقی شخصیت کا ایک تشکیلی عنصر ثابت ہوا؟ لیکن یہ بات جُزوی توضیح تو ہو سکتی ہے، اور کچھ نہیں۔

اتنا تو بالکل واضح ہے کہ اگر جعفری کا مطمحِ نظر یہ ہوتا کہ ان کا کہا فوراً سمجھ میں آ جائے یا انہیں قبولِ عام حاصل ہو تو وہ بڑی آسانی سے ایسی نظمیں لکھ لیتے جو سہل پسند قارئین کو بہت پسند آتی ہیں۔ بطور فنکار انہیں فنِ شعر کے لوازمات پر عبور جو حاصل ہوا۔ اصل میں وہ کسی طور مصالحت پر آمادہ نہیں۔ انہیں اپنے وژن کی انجوگی عزیز ہے اور اس انجوگی میں تحریف کرنا ناگوار گزرتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے کلام میں ذاتی تجربوں کی پیچیدگی اور جذبات کے مکدر بہاؤ کو تقریباً ان گھڑ حالت میں، تراشے خراشے بغیر، رچایا بسایا ہے۔ جہاں جہاں ان تجربات یا احساسات کے بعض اجزا تحلیل ہونے میں نہ آتے تھے انہیں جوں کا توں چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی الجھی سلجھی اور ناتراشیدہ حالت میں، نوکیلے پرچموں کی طرح، نظم کے خونابے (Plasma) میں تیرتے دکھائی دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بہترین شاعری بھی تھوڑا اٹک اٹک کر آگے بڑھتی ہے۔ یہ کیفیت بالخصوص ان کی نظم "آئینہ خانہ" کی زودجت آمیز اور بلوریں درخشندگی رکھنے والی غنائیت میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

"آئینہ خانہ" خاصی پیچیدہ نظم ہے۔ اسے پڑھنا تو مشکل نہیں لیکن جب مسئلہ تفہیم کا پیدا ہوتا ہے تو لگتا ہے ہم کسی متھے کے روبرو ہیں۔ نظم کہیں چھ سال میں مکمل ہوئی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کسی ارتجالی کیفیت کی حامل نہیں۔ لیکن شاعر چاہتا بھی نہ تھا کہ نظم پڑھتے ہوئے آمد کا احساس ہو۔

بنیادی سوال یہاں فقط یہ ہے: میں کہاں ہوں؟ صحیح راستے پر چل رہا ہوں یا بھٹک گیا ہوں؟ لیکن ایسی دنیا میں جو آپ کو منعکس کرتی ہے اور جہاں آپ اپنی ذات میں دنیا کو منعکس کرتے ہیں، یہ بنیادی سوال بہت جلد تشابہوں کے ایک لامتناہی سلسلے میں بٹتا چلا جاتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ شکوک کا ایک انبار لگایا جا رہا ہے۔ سوال صرف یہی نہیں رہتا کہ میں کہاں ہوں بلکہ یہ بھی پوچھنا پڑتا ہے کہ میں کون ہوں؟ سوالوں کا ڈھیر لگتا جاتا ہے۔ کیا دنیا حقیقی ہے؟ کیا میں حقیقی یا سالم ہوں؟ کیا دوسرے حقیقی ہیں یا محض میرا عکس ہیں؟ کیا دنیا میرا عکس ہے؟ کیا باہر نکلنے کی کوئی راہ ہے؟ نظم جوں جوں آگے بڑھتی ہے، ذاتی، تاریخی اور اسطوری عاجزوں سے بوجھل ہوتی جاتی ہے؛ اور ان عاجزوں کو ترتیب اس طرح دیا گیا ہے کہ ناظر کی شناخت پر زندہ پھر جاتا ہے۔

نظم کی ساخت زینہ پیچاں سے مشابہ ہے۔ پہلے حرکت اوپر کی طرف ہے۔ پھر نظم نیچے کو پھسلتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ نقطہ جہاں نظم کی صعودی کیفیت اتمام کو پہنچتی ہے اور نزول کا آغاز ہوتا ہے بالکل وسط میں واقع نہیں۔ یہ نقطہ بظاہر سترھویں نظم میں آتا ہے جہاں ایک اسطوری شخصیت نمودار ہوتی ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ سب کچھ خاک میں مل چکا۔

یہاں جس امر کی طرف صراحت سے اشارہ کیا جا رہا ہے، یہ ہے: تاریخ کے کسی دور میں انسان خود کو اتنا غیر محفوظ اور تنہا محسوس نہ کرتا تھا جتنا اب محسوس کر رہا ہے۔ بنیادی سوال، جن کا بظاہر جواب ممکن نہیں، نہ صرف افق پر محیط ہو کر ہمارے سر پر جھکے پڑ رہے ہیں بلکہ مسخ بھی ہو چکے ہیں۔ نظم کا جو لہجہ سب سے زیادہ قائل کن ہے اس سے ایک ایسے آدمی کی تمثال سامنے آتی ہے جو مسخ کر دینے والے آئینوں سے آراستہ کسی خیابان میں قدم زن، اثبات اور انعدام کے درمیان پیدا ہونے والی کشیدگیوں کو اپنے میں جذب کرتا ہوا، کسی آخری تنہائی میں اترتا جا رہا ہو۔

یہ کالم اپریل ۱۹۸۲ء میں "پاکستان ٹائمز" میں شائع ہوا تھا۔ اسی کو معمولی ردوبدل کے ساتھ اردو میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اختر حسین جعفری نے "آئینہ خانہ" کے بعد بہت کچھ لکھا۔ ان کے نئے کلام کی روشنی میں آج سے دس برس پہلے لکھے گئے کالم کے مندرجات بلاشبہ نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ بہرکیف، جعفری صاحب کے شعری مرتبے کا تعین نقاد حضرات بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ یہ کالم نویس کے بس کی بات نہیں۔ (محمد سلیم الرحمٰن)

صابردت کا تاریخ ساز کارنامہ

اُڑتے ہوئے لمحات کو زنجیر کیا ہے
تاریخ کو تصویر میں تحریر کیا ہے

چند تصویر بتاں

صابردت

قیمت: پانچ سو روپے، بیرونِ ہند پچھتر (۷۵) امریکی ڈالر

جس میں ۱۲۵۲ء سے ۱۹۳۰ء تک کے مشاہیر زبان و ادب کی تصاویر سن وار شائع کی گئی ہیں۔

اُردو میں اپنی نوعیت کا پہلا ادبی البم ❊ آفسٹ طباعت، آرٹ پیپر، برقی سازو

ملنے کا پتہ:- ساحر پبلشنگ ہاؤس۔ "پرچھائیاں" اے، بی نائر روڈ، جوہو، چرچ گیٹ، بمبئی ۴۰۰۰۴۹ (بھارت)

اختر حسین جعفری — ایک منفرد تخلیق کار

محمد علی صدیقی

اختر حسین جعفری اُن معدودے چند شعرا میں سے تھے جنہیں، بحیثیت ایک نظم گو، آناً فاناً میں شہرت ملی اور اُنہوں نے آخری وقت تک خود کو اِس شہرت کا اہل، بلکہ اِس سے بھی زیادہ شہرت کا حق دار ثابت کیا۔ میں نے اختر حسین کو ذرا قریب سے دیکھا ہے۔ وہ بحیثیتِ انسان اور شاعر، میری نگاہ میں، شروع ہی سے اعلیٰ درجہ پر فائز رہے۔

اختر حسین جعفری کا مجموعہ "آئینہ خانہ" شعری فن پاروں کی ایک ایسی گیلری ہے جو ہم عصری اُردو شاعری کی اعلیٰ پختگی اور اپنے حسین لسانی پیکروں کے لئے جدید اُردو شاعری کے لیے سرمایۂ افتخار ٹھہرے گی۔ ایک ایسے دَور میں جب زبان اور شاعری سے روایت اور تاریخ کو جلا وطن کیا جا رہا تھا اور وہ بھی مانگے تانگے کے نظریات کے سہارے، اختر حسین جعفری نے اپنی شاعری سے یہ ثابت کیا کہ ہر شاعر کی اپنی شعری روایت بھی ہوتی ہے جس سے روگردانی ممکن نہیں ہو پاتی۔ شعری روایت سے مضبوط رشتہ ہی کی وجہ سے شاعر زمانۂ حال کی دگرگونی اور مستقبل آفرینی کی کشمکش کے ہنگام، اپنے عرفان، اپنی آگہی اور اپنے اقدار کے تحفظ کے لیے، ماضی کے نہفتہ اور فراموش شدہ خزینوں سے زندہ علامتیں اور تمثالیں تراشنے میں کامیاب ہو پاتا ہے۔ جعفری کی طویل نظم "آئینہ خانہ" منفرد ہیئت اور مواد کے پیچیدہ ملاپ کی بیّن مثال ہے۔

جب مجھے "آئینہ خانہ" کے پہلے ایڈیشن کا نُسخہ موصول ہوا تو میں نے اختر حسین جعفری کو اس مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ "آپ کی نظمیں خوبصورت بلّوری ظروف کی مانند ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ہر نظم پر ایک ماہر ظروف ساز اپنے تخیل کے بیل بوٹے اُگا رہا ہو ——" اُنہوں نے اپنے جوابی خط میں "آئینہ خانہ" کی شاعری کے ارتقاء کی روئیداد بیان کی تھی۔

یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ میرے مرحوم دوست کے قلب و ذہن پر کربلا کی تمثالیں (IMAGES) اور علامتیں (SYMBOLS) ثبت تھیں اور اُنہوں نے بڑے سلیقہ اور فنی ریاض کی بدولت سانحۂ کربلا کی تمثالوں کو اس خوبصورتی کے ساتھ برتا کہ لاشعور کے جمالیاتی حوالے قارئینِ شاعری کے لئے ذاتی تجربہ بن گئے۔

دیکھا جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ "آئینہ خانہ" ہم عصری شہر آشوب ہی کی خوبصورت مرقع نگاری نہیں ہے بلکہ یہ مجموعہ اختر حسین جعفری کی مرغوب شعری زبان کا آئینہ دار بھی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد کی شاعری میں وسیع تر کینوس پر سفر کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ آخری چند برسوں میں اپنے قارئین کو اپنی پختہ کاری اور گہری نظریاتی وابستگی کے ساتھ ہم عصری دَور کی نیرنگیوں کی گہری معنویت کا سُراغ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"آئینہ خانہ" کے اوّلین ایڈیشن (۱۹۸۱) میں شامل پیش لفظ بہ عنوان "زمین کا اوّلین مکتوب"، جو دوسرے ایڈیشن (۱۹۸۸) میں بھی موجود ہے، اختر حسین جعفری کی شعری بوطیقہ کی تفہیم کا بنیادی حوالہ ہے۔ اور "آئینہ خانہ" کے بعد کتابی سلسلے "فردا" کی ادارتی پالیسی

میں بھی وہی کھلا پن ملتا ہے جو "آئینہ خانہ" کے پیش لفظ میں نظر آتا ہے۔ جعفری قانونِ فطرت کے وکیل تھے۔ لیکن سرسید اور حالی سے قدرے مختلف معنوں میں۔ وہ فطرت سے وابستگی کے ذریعہ جمالیاتی پیکروں کی کلیت پر بھی غور کرتے تھے۔ ہر مظہر اپنی شناخت کی پہلی نشانی یا صورت سے اپنی پہچان کی آخری یا غیر مختتم نشانی کے ظہور تک ہماری چشمِ بینا پر نجانے کتنے مناظر وا کرتا ہے لیکن یہ ایک عجیب التزامِ فطرت ہے کہ ہمارے حافظہ میں یعنی چشم و ذہن پر صرف وہی مناظر باقی رہ جاتے ہیں جو جہد البقا کی عظیم جنگ میں ارتقا کی قوتوں کے ساتھی ہوتے ہیں۔ بات یہاں تک آتی ہے کہ آج صرف وہی پرند، چرند، اور نباتات محفوظ ہیں جنہوں نے ہمارے جمالیاتی تقاضوں کا ساتھ دیا ہے۔ "انسان عظیم ہے خدایا" کی سطر منبع الہام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی طالب نہیں ہے بلکہ ایک عارف انسان زمین اور کائنات پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ وہ واقعتاً اپنے خالق کی تخلیقی توانائی، ندرت جوئی اور قدرت کی حجت بن چکا ہے اور خدا کی عظمت اور قدرت یہی حجت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

اختر حسین جعفری نے "آئینہ خانہ" کی نظموں کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ نظمیں ایک ایسی کیفیت کے انسان کی ذہنی حالت کی ترجمان ہیں جو زمین پر گری صلیب کے میزان کے ایک پلڑے میں "یرغمالی کی صورت زندہ اپنی رہائی کی قیمت پوچھ رہا ہے"۔ ہواؤں اور ستاروں سے گفتگو کرنے والا اختر حسین جعفری پھول اور دھنک کے مابین مکالمہ کا گواہ بھی ہے اور پیوند لگی چادر کی دھواں چھوڑتی چلموں (MILLS) کی جانب سے آنے والے نوحوں کی صدائیں بھی جو خاردار تاروں کی چار دیواری سے ٹکرا رہی ہیں۔ وہ حواسِ خمسہ کے علاوہ چھٹی حس (جو حسِ تخلیق کار قرار دی جا سکتی ہے) سے صرف اپنے شعری ماضی ہی کی طرف نگراں نہیں ہے بلکہ وہ غالب، ایذرا پاؤنڈ، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ جیسے مستند ہنرمندوں اور پبلو نرودا، رابرٹ لوسینی جیسے باصلاحیت ہم فکر اور ہم عصر رفقائے کار کی علمی مصاحبت میں ملے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اختر حسین جعفری نے مندرجہ بالا زعمائے شاعری کے "مستند ہنرمندوں" اور "باصلاحیت ہم فکر اور ہم عصر رفقائے کار" کی علمی مصاحبت سے جو کچھ حاصل کیا ہے اس کا تمام تر زور ہنرمندی اور فکری صلاحیت پر ہے جس کے بغیر "شعری تمثیلات اور پیکر سازی کے حوالے سے ترسیل میں تو یہ پیرہن تلاش کرنے کی تخلیقی خو ممکن نہیں ہو سکتی۔ اختر حسین جعفری نے اپنے فن کے نقادوں کو اپنی شعری دنیا کے سفر پر گامزن ہونے کے لئے جو "کلید" فراہم کی ہے وہ اختر حسین جعفری میں چھپے ہوئے ایک نقاد سے متعارف کرواتی ہے۔ فی زمانہ ہمارے ملک میں ساختیات، ساخت شکن طریقۂ متن، متن آفرینی اور پسِ ساختیات جیسے موضوعات پر بحث و مباحثہ میں سرگرم حضرات سے ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر انہیں تخلیق دشمن مکتبِ انتقاد سے اس قدر شغف کیوں ہے؟ مانا کہ یہ تنقید بھی تخلیق ہی کا درجہ رکھتی ہے لیکن کیا ایسا نہیں ہے کہ اس نوع کی تخلیقیت (CREATIVITY) کا سہرا تنقید نگار کے کھاتے میں جاتا ہے، اور بحیثیت تخلیق کار کے حصہ میں نہیں۔ اس طریقۂ انتقاد سے "مسجدِ قرطبہ" میں خود اقبال کے لئے قابلِ قبول معانی اور صنائع و بدائع کا نظام ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے اور صرف ساختیاتی نقاد کے فراہم کردہ نئے معانی اصل تخلیق پر حاوی آجاتے ہیں۔ اس انتقادی خلاقی کو سائنسی اندازِ نظر کا نام دیا گیا ہے، جبکہ یہ مکتبِ فکر خالصتاً موضوعی عینیت پسندی (SUBJECTIVE IDEALISM) کی ذیل میں آنا چاہیے۔ انسانی اقدار کی تاریخیت اور مقصدیت سے عناد کے بعد الہامی کتب متون (TEXTS) بھی معرضِ خطر میں پڑ سکتے ہیں۔ میرے سولہ سال قبل شائع شدہ مضمون "اسٹرکچرل ازم" کا بنیادی استدلال ہی یہ تھا کہ ہمارا وہ سارا ادبی سرمایہ جو انسانیت افروز ہے اور ایک غیر منصفانہ نظام پر چلنے والی دنیا میں انصاف کا جویا ہے، اسے ساختیات کی ہلاکت خیزی سے بچانا چاہیئے۔ ہمارا جملہ شعری سرمایہ، پندرھویں صدی کے شعرا سے لے کر آج کے نوجوان شعرا کے کلام تک "موت" کا سزاوار نہیں۔ بہرحال اقبال، فیض، میرا جی اردو غزل کے عناصر اربعہ ندیم، راشد، سردار جعفری، اختر الایمان اور دیگر اہم شعرا

نے (جن میں آج کے نوجوان شعرا بھی شامل ہیں) ساختیات کے مکتبِ فکر کے ہاتھوں "خالصتاً سائنسی مطالعہ کی سان پر درست ثابت ہو سکنے والے معانی" کی شاعری نہیں کی ہے۔

اختر حسین جعفری نے مشرق و مغرب کے جن بزرگ شعراء کی ہُنرمندی، فکری صلابت اور قوتِ متخیلہ کا ذکر کیا ہے وہ غالباً خود اُن کی شاعری کے تخلیقی مثلث کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں مشرقی انتقادیات کے لئے خصوصی رغبت نہیں ملتی لیکن جدید مغربی شاعری کے بعض اکابر کے یہاں پائی جانے والی کائنات گیر سنجیدگی اور زندگی افروز حسّی اور پاؤنڈ کی شاعری میں اعلیٰ سنجیدگی اور اسے بمنزلہ عبادت گردانے پر زور دیتے ہیں۔ وہ نیرودا کی شاعری کو حُسن اور خیر کی جدوجہد کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ مذکورالذکر صورتِ حال اختر حسین جعفری کی ترقی پسند تحریک سے رغبت کی دلیل ہے۔ وہ ہم عصر شعرا میں احمد ندیم قاسمی سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔

میں نے اُن کی شاعری میں لاشعوری تمثالوں کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ آپ نظم "امتناع کا مہینہ" سے چند سطری اقتباس ملاحظہ کیجیے:-

اس مہینے میں غارت گری منع تھی، پیڑ کٹتے نہ تھے
تیر چلتے نہ تھے

بہر پرواز محفوظ تھے آسماں
بے خطر تھی زمیں مستقر کے لیے
اس مہینے میں غارت گری منع تھی، یہ پرانے صحیفوں میں مذکور ہے
قاتلوں، رہزنوں میں یہ دستور تھا، اس مہینے کی حُرمت کے اعزاز میں
دوش پر گردنِ خم سلامت رہے .....
..... اس مہینے کئی تشنہ لب ساعتیں، بے گناہی کے کتبے اُٹھائے ہُوئے
روز و شب بَین کرتی ہیں دہلیز پر اور زنجیرِ در مجھ سے کھلتی نہیں
فرشِ ہموار پر پاؤں چلتا نہیں
دل دھڑکتا نہیں
اس مہینے میں گھر سے نکلتا نہیں

(۱۹۷۹ء)

اوپر دی ہوئی سطروں کے مجموعی تاثر کی تعمیر اس حقیقت کی غمّاز ہے کہ شاعر نظم کے عنوان، "امتناع کا مہینہ"، کی پہلی سطر سے آخری سطر تک شاعری کے فن اور اپنے ذاتی تجربہ کو ایک دوسرے میں سہولت سے سمونے میں کامیاب رہا ہے۔ نظم اپنے قاری کو حیرت و استعجاب کے جذبات سے گزارتی ہوئی اُن طاغوتی طاقتوں پر، طنز کے گہرے تیر برساتی ہے جنہوں نے شاعر کے لئے ماہِ محرم کو ایک ایسا مہینہ بنا دیا ہے کہ اس ماہ شاعر کے دل کی دھڑکن بند ہو جایا کرتی تھی اور گھر سے باہر نکلنا بھی نواہی کے ذیل میں آجاتا تھا۔ (کیا یہ خوبصورت تخیل نہیں ہے؟)

اختر حسین جعفری کی نظم "سُولی سے عیسیٰ اُترے تو" عجیب و غریب کیفیات کو نظم کرتی ہے:

سُولی سے عیسیٰ اُترے تو تیز ہوا کا زور تھمے
قاتل ہاتھوں کا زخم بھرے
تخت سے عیسیٰ کب اُترے گا
عہد ہمارا عہد ملامت، عہد خجالت
ایک اپاہج کی بیساکھی کتنے لنگڑوں کے کام آئے
ہم سب لنگڑے اور اپاہج، سب کے جسموں پر ناسُور ہیں اور اس کے اعجاز کا مرہم
کم مقدار ہے صبر طلب ہے اور گراں ہے ....
سُولی سے عیسیٰ اُترا تو گردن خم تھی
سُولی سے عیسیٰ اُترا تو اپنی خبر، اپنے الہام سے شرمندہ تھا

(۱۹۷۷ء)

یہ نظم اپنے سالِ تصنیف کے جس ہم عصری آشوب کی نشاندہی کر رہی ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ شاعر اپنی نظم کی آخری سطروں میں مشہور امریکی افسانہ نگار او۔ ہنری کی طرح ڈرامائی "تضاد" کے احساس کو اس خوبی سے اُجاگر کرتا ہے کہ اُس کی شاعری قارئین کے لئے بھی شدید نوعیت کا ذاتی تجربہ بن جاتی ہے۔

میں ساختیاتی تنقید کے "معنیٔ بُتِ ہزار شیوہ" کا قائل ہو سکتا ہوں لیکن آخر معنیٰ کی اُس پرت کو جس پر خود شاعر لہلوٹ ہو جایا کرتا ہے یا جسے وہ زیادہ درست خیال کرتا ہے اُسے بہرطور اوّلیت ملنی چاہیے۔ ساختیات اور ردِ تشکیل (DECONSTRUC-TION) ہماری شاعری سے وہ تہذیبی رس چھین لے گئی جس کے لئے ہماری شاعری ممتاز ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اب مغربی شاعری میں "ثقافتی اور تہذیبی اقدار" پر خصوصی زور ملتا ہے۔ ثقافتی تنقید یا اقداری تنقید ہی ثقافتی بوطیقہ (CULTURAL POETICS) اور نئی تاریخیت (NEW HISTORICISM) کے علاوہ کیا ہے؟

اختر حسین جعفری کی فن کاری بلاشک و شبہ ایک مفصّل مطالعہ کی متقاضی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اختر حسین جعفری اور اُس کے ہم عصروں کی شاعری کے مطالعہ کے لئے "ثقافتی بوطیقہ" اور اُس کے تہذیبی اور فکری حوالوں کے بغیر کس طرح ممکن ہو سکے گی؟ کیا ہم "ہوا نے کھول دیے بھید" کے مندرجہ ذیل اقتباس پر غور کر سکیں گے؟

ہوا نے بھید سبھی موسموں کے کھول دیے
شہادتوں کا ہر اک نقش منحرف نکلا
رُخِ بشر سے جو پردہ اُٹھا تو بھُولے ہیں
وہی تھا چہرہ جو صبحِ ازل کو دیکھا تھا

کیا شاعر زندگی کے آخری دن والے "صبحِ ازل کے چہرہ" سے پیدا ہونے والے احساسِ حیرت کے متعین معنوں میں کوئی ایسی معنوی ترمیم قبول کر سکتا ہے جو شاعری کی اعلیٰ تنجیدگی کو پسِ پشت ڈال سکے؟ اگر نہیں تو پھر تخلیق کار کو تخلیق کار قرار دینے میں کیا حرج ہے۔ افسوس کہ اب اختر حسین جعفری زندہ نہیں ہیں لیکن اُن کے کلام میں جگہ جگہ مستور "تہذیبی دفینوں" کے اندر تلاشِ معانی کا کام جاری رہے گا اور "ہوائے شام" سے مطالبہ کیا جاتا رہے گا کہ وہ بچ کر چلے کہ، تا ہنوز وہ محسوس کردہ موجِ خوں ہمارے سروں پر سے گزر رہی ہے جسکے احساس نے ان دفینوں کو جنم دیا تھا۔

محشر بدایونی

قطعۂ تاریخ

وفات [اختر حسین جعفری]

ہر لوحِ دل پہ نقش ہیں اُن کی یہ خوبیاں
خوش فکر، خوش نگاہ، خوش احساس خوش بیاں
کی فکرِ سالِ مرگ تو دل نے یہ دی صدا
"اختر حسین جعفری ہیں ساکنِ جناں"

۱۹۹۲ء

خالد احمد

تاریخِ وفات

ڈوب گئے مہر و مہ و فکر و فن
دیکھ ترا آخری تارا گرا
اے سببِ نورِ نجومِ سخن
کہہ! فلکِ نظم نگاری بجھا

۱۴۱۲ھ

شفیق سلیمی

اختر حسین جعفری کیلئے

محبت کو مجسم دیکھتے ہیں
ترے پیکر کو پیہم دیکھتے ہیں

کرشمہ ہے ترے دستِ ہنر کا
سدا خوشبو کا موسم دیکھتے ہیں

ترے لفظوں میں روشن ہیں ستارے
تری سطروں میں سرگم دیکھتے ہیں

سبھی چہروں پہ چھائی ہے اُداسی
سبھی آنکھوں کو پُرنم دیکھتے ہیں

تجھے اب ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے
ترے جیسا کوئی کم دیکھتے ہیں

تُو وہ اختر ہے جس کی ضَو کے آگے
کئی سُورج بھی مدھم دیکھتے ہیں

(ابوظبی)

حزیں لدھیانوی

بیادِ اختر حسین جعفری

موت کا رقص جب ہُوا جاری
زندگانی تجھے پکارے گی
دل میں رکھے گی تیری یاد کی لَو
یہ کبھی موت سے نہ ہارے گی
چاہے ہوں لاکھ اُداسیاں طاری

ہوئی جس دم خزاؤں کی یلغار
گلِ اشعار تیرے مہکیں گے
اور پت جھڑ شکست کھائے گی
ڈالیوں پر پرند چہکیں گے
تیرے افکار کی پڑے گی پھوار

جب ہُوا چار سُو شبوں کا راج
"آئینہ خانہ" تیرا چمکے گا
اور پھیلے گی روشنی ہر سُو
درد کا چاند پھر سے اُبھرے گا
اور بدل جائے گا سیاہ سماج

یاد آئے گا تُو سدا اختر
شاعرِ زیست، خوشنوا اختر

وحی کنجاہی

محبتوں کا سفیر اختر حسین جعفری

وہ اپنے ذہن سے ہر بات سوچنے والا
وہ اپنی آنکھ سے ہر چیز دیکھنے والا

وہ آمروں کا حریف اور حلیفِ مظلوماں
وہ یارِ تفتہ دلاں، خیر خواہِ معصوماں

وہ عندلیبِ گلستانِ دورِ نا پیدا
وہ نوحہ خوانِ زمانہ، وہ شاعرِ فردا

وہ حرف حرف کا نباض اور مزاج شناس
عظیم نظم نگار اور زیست کا غوّاص

وہ اُلفتوں کا اسیر اور محبتوں کا سفیر
وفا و مہر کا پیکر، خلوص کی تصویر

قلم کو شیشۂ خوں میں ڈبوتا رہتا تھا
وہ سطر سطر میں موتی پروتا رہتا تھا

سیّد امداد ھمدانی

جعفری کا نوحہ

زندگی کی بھری رہگزر چھوڑ کر
وہ کہاں جائے گا یہ نگر چھوڑ کر

ہر کوئی پوچھتا ہے کہاں چل دیا
شاخِ اُمّید کو بے ثمر چھوڑ کر

اک مغنّی گیا، اپنی آواز کا
پتھروں پر بھی اپنا اثر چھوڑ کر

ایک پل میں وہ ہم سے جدا ہو گیا
زندگی کا اُدھورا سفر چھوڑ کر

اقبال کوثر

کبھی شہرِ جاناں میں ...

(اختر حسین جعفری کیلئے ایک نظم، جو اُن کی زندگی میں لکھی گئی)

کبھی شہرِ جاناں میں اپنا گزر ہو
تو ہم بھی اُسی قہوہ خانے میں اُتریں
جہاں بیٹھتا ہے وہ محبوبِ خوباں
ملے تو بہت دیر تک اُس سے باتیں کریں
— جس سے باتیں نہیں کیں بہت دیر سے
اور کہیں، "وہ کبھی رابطے کے دنوں میں
جو ہم دیکھا کرتے تھے اک ساتھ سپنا
اُسے ٹوٹے مدّت ہوئی، پر وہ اب بھی
لہو رنگ عکسوں سے ہم کو
رگِ جاں رگِ جاں شفق دے رہا ہے
شفق زندگی کی
شفق حوصلے اور محبّت کی پائندگی کی"
کہیں گے، "سنا کچھ احوال اپنے اور اے جانِ خوباں
نئی تازہ نظمیں؟"
کہے گا، "بجا ہے جو ہم لکھ رہے ہیں
اُسی ٹوٹے سپنے کی خوں تابیاں ہیں
اُسی کے لہو کے وہ چھینٹے ہیں جو صرف
منقوشِ دیوارِ مقتل نہیں ہیں
وہ ایک ایک ذرّے کو
ایک ایک لمحے کو
اپنی تپش اور دھڑکن کا اعجاز بخشے ہوئے ہیں
جنہیں اپنی مژگانِ فن چن رہی اور آرائشِ حرفِ جاں کر رہی ہیں،
— مگر اپنا لکھنا بھی کیا
بس یہی حرفِ لوح و قلم ساتھ ہیں
راہِ تخلیق میں آج بھی اب تلک اپنی خاک اور خوں کے سفر
دل خواب و غم ساتھ ہیں،
اپنی نظمیں بھی کیا؟ —
بس اُسی کربلا اور نینوا اور پھر اک نئے کربلا کے مسلسل ہیں ادوار وقت ہمارا
وہ کہے گا کہے جائے گا —
میں سنوں گا سُنے جاؤں گا
اور پھر غالباً —
چائے کی میز پر ہم بچھڑ جائیں گے — مدّتوں کے لئے
مدّتوں پھر ملاقات شاید نہ ہو —
اور ممکن ہے، شاید ہم آپس میں ہم ربط سپنوں
کے خوں تاب عکسوں میں، نظموں کے حرفوں میں
ملتے رہیں بھی —
مگر یوں بھی ہے —
اپنے امکانِ فردا میں کچھ دُوریاں ہوں
تو یہ قربِ لمحات شاید نہ ہو
کتنی خواہش کے بادل اُمڈتے پھریں
اس کے باوصف، برسات شاید نہ ہو

(کالا گوجراں جہلم، ۱۹۹۱ء)

اقبال کوثر

اب بہت دیر ہو گئی ہے

جعفری مرحوم کی یاد میں

وہ آنے والا ——
ابھی تک آیا نہیں ہے اور رات آ گئی ہے
تمام دن کا گیا ہوا وہ کہاں گیا ہے؟
وہ جانِ یاراں کہ صبح اپنے ہی درمیاں تھا
اور اُس سے طے تھا کہ آج کی شام
ہم اکٹھے بسر کریں گے
ابھی تک آیا نہیں ہے وہ
اور قہوہ خانے کی میز پر —— ہم ابھی تک اُس کے منتظر ہیں
کسی نے دیکھا؟ کہ جانے والا تو گھر بھی لوٹا نہیں ابھی تک
کہیں نہ دفتر کے کاغذوں میں 'قلم بہ زنجیر' ہو گیا ہو

کسی نے دیکھا؟ وہ اپنے دفتر سے واپسی پر 'فنون' ہی کو نہ چل دیا ہو
کہیں نہ ایسا ہوا ہو شاید —— وہ صبح آفس سے ہو کے 'پنڈی' نکل گیا ہو
کہیں وہ 'پھٹی سڑک'[1] کی جانب نہ چل دیا ہو —— جہاں کبھی محکمے کے دفتر میں اُس نے اپنے
قیام کے ماہ و سال کاٹے —— جہاں کبھی عکس عکس
'آئینہ خانہ' کو اُس نے ایک تازہ تریں طرازِ ہنر عطا کی،
گداختہ خوں کے رنگ بخشے اور اپنے 'آشوبِ عہد' کی نوحہ نوحہ
زندہ نگارشیں دیں
پتہ لگاؤ کہ وہ کہاں لاپتہ ہوا ہے؟
وہ گوجرانوالہ میں نہ ٹھہرا ہوا ہو —— آباد رابطوں کے صبیح دن دل میں ڈھال کر
اور شہر داری کی دوست یادوں کے نقش لے کر
یہاں سے نکلا ہوا —— کہیں غالباً نہ 'گجرات' آگیا ہو —— (پرانی یادوں اور اپنی پہلی محبتوں اور رفاقتوں
کا حساب کرنے)
کہ جس کی گلیوں میں اور دانش گہوں میں اُس کی ذہانتوں میں گندھی
ہوئی اوّلیں بہارِ شباب گزری
مگر نہیں شاید اُس کو 'لاہور' ہی میں ہونا ہے اور بیرونِ شہر شاید نہیں نکلنا
کہ اُس کی دفتر کو اور گھر کو ابھی بہت سی ضرورتیں ہیں
کوئی پھر اک بار —— آخری بار —— اُس کے گھر سے پتہ لگائے
کہ باپ، آشفتہ حال بچوں کے پاس اپنی تمام شفقت سمیٹ کر

---

[1] سکستھ روڈ - راولپنڈی کی ایک سڑک۔

گھر نہ آگیا ہو
(کوئی مجسم خیال بن کر)
اور اُن کو اپنے 'وراگ' میں بھی وصال کا کوئی آخری پیار دے رہا ہو
نہیں تو شاید —— بجھی ہوئی آنسوؤں میں آنکھوں کی پتلیاں ہوں جو گھر کی دہلیز پر جمی ہوں
نہیں تو شاید —— وہ ناشکیبا سماعتیں ہوں جو آنے والے کی آشنا آہٹوں کی رہ سے لپٹ رہی ہوں
کہاں کا کوئی پیامبر ہو؟ جو غم زدہ گھر کے بیچ، بچوں میں اُن کے ابو کی واپسی کی
کوئی بشارت بکھیر آئے
مگر نہ جانے کہاں گیا ہے وہ جانے والا
کہ اس قدر دیر ہوگئی اور قہوہ خانے کی میز پر
ہم ابھی تلک اُس کے منتظر ہیں
ابھی ابھی میز پر پڑے پھولدان سے جو گلاب کی پتیاں اُڑی ہیں، کہاں گری ہیں؟
ہمارے آگے بھری ہوئی راکھدانیوں میں
جلے ہوئے آج کتنے سگریٹ بجھے ہوئے ہیں
ابھی ابھی نیم تیرگی میں جو مسکرایا تھا ایک جگنو، کدھر گیا ہے؟
جو آئینے نصب بائیں دیوار پر ہیں —— کیوں آج عکس اُن کے کٹے کٹے ہیں؟
چلو چلیں —— ایک بار پھر گیٹ پر نکل کر، ہم آنے والے کی راہ دیکھیں
وہ دیکھنا —— وہ سفید براق نیون سائنز اور رنگین برقموں کی ملی جلی جگمگاہٹوں کی روشنی پہ
لوگوں کی آمد و شد کے درمیاں —— اور ذرا اُدھر
چاندنی کی لو میں سبک روی سے قدم اُٹھاتا —— وہ کون اس سمت آرہا ہے؟
- - - - - - - - - - مگر نہیں وہ تو وہ نہیں ہے

ذرا اُدھر ـــــ دوسری طرف دیکھنا رشید
وہ آتے جاتے ہجوم رہگیر کے عقب میں نہ آ رہا ہو
وہ دیکھنا، وہ جہاں ابھی اک چمکتی گاڑی رُکی ہے جا کر
سفید ملبوس میں ـــــ اُسی دُھال کا کوئی شخص
کون اس سمت آ رہا ہے ؟
. . . . . مگر نہیں، وہ تو وہ نہیں ہے

چلو چلیں اب ـــــ کہ اب نہ آئے گا آنے والا
چلو چلیں . . . . . آج منظرِ شب اُداس کیوں ہے ؟
فضا نم آلود ہو رہی ہے
یہ واہمے دل میں کون سے ہیں
یہ کس طرح کے سراب آنکھوں میں ڈھل گئے ہیں
کہ بجلیاں جل رہی ہیں اور بجھ رہی ہیں جیسے
نہ جانے گلشن[1]، یہ صاعقہ کیا گری ہے ویرانیٔ خزاں کی
یہ ٹکڑا ٹکڑا دھوئیں کے بادل کہاں سے اُٹھ اُٹھ کے مل رہے ہیں
ہواؤں میں کیسی سسکیاں ہیں
وہ دُور بجھتے ہوئے ستاروں کو "ہچکیاں آ رہی ہیں" جیسے
وہ چاند بھی ماند ـــــ جیسے "بدلی میں چھپ کے" آنسو بہا رہا ہے

---

[1] گلشن اقبال لاہور۔ جعفری مرحوم کی آخری قیام گاہ "علامہ اقبال ٹاؤن" کی ایک سیر گاہ۔

یہ دیکھتے دیکھتے کہاں کا ——— کہاں کا جانے ——— یہ بیگانا بیگانا سا موسم
ہماری پلکوں پہ آگیا اور ہماری آنکھوں سے
آنسو آنسو ٹپک پڑا ہے

زمیں کا مکتوب آخری[1] بادلوں کے نام آگیا ہے شاید
چلو چلیں اب ——— چلو اب اس کو ہوا کے ہاتھوں
ہم آنسوؤں کا پیام بھیجیں
کہ اپنے آئینہ ادنگوں کے حزنیوں ——— اور "اداس کہسار[2]" کی غزا خوانیوں
کی دانش کے رنگ لے کر
ہماری شاموں کی ہمنشینی کی صف میں کل وہ ضرور آئے گا
اور کل اس کے پیر سے ہم منتظر رہیں گے
چلو چلیں اب
چلو چلیں اب ——— کہ اب بہت دیر ہوگئی ہے
کہ اب ——— بہت دیر ——— ہوگئی ہے۔

---

[1] "آئینہ خانہ" کا ایک مصرع جسے یہاں معنوی تصرف کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

[2] جعفری مرحوم نے رحلت سے پہلے جو چند نظمیں لکھیں ان کے لئے مرحوم نے "اداس کہسار کے نوحے" کا عنوان منتخب کیا تھا

عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ

"آئینہ خانہ" کے مرحوم مصنف سے ایک گفتگو کا تاثر

رشید ملک

"آئینہ خانہ" اختر حسین جعفری کا مجموعۂ کلام ہے۔ اس کی سب سے لمبی نظم کا عنوان "آئینہ خانہ" ہے اور نظم کے عنوان کی مناسبت سے مجموعے کا نام بھی آئینہ خانہ رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن دسمبر ۱۹۸۹ء میں آیا۔ اس کتاب پر محمد علی صدیقی، محمد سلیم الرحمن، ڈاکٹر سلیم اختر اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔ ایک اور صاحب نے بھی آئینہ خانے پر اظہارِ خیال کیا اور یہ "ماہِ نو" میں شائع ہوا۔

شاعری کی کتاب پر اظہار خیال کرنے والا بیک وقت قاری بھی ہوتا ہے اور نقاد بھی۔ اس لئے اس کا معاملہ عام قارئین سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ شاعر کہہ رہا ہے یا کہنا چاہتا ہے وہ کلی طور پر عام قاری تک پہنچ سکے۔ شاعر کے مافی الضمیر سے کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ البتہ نقاد کا معاملہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔

"آئینہ خانہ" کو محمد سلیم الرحمن نے بڑی سنجیدگی سے پڑھا ہے اور بحیثیت ایک نقاد کے شاعر کے مافی الضمیر تک پہونچنے کی بڑی پرخلوص کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس کے کونٹنٹ کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کے خیال میں تنہائی کا مارا ہوا ایک شخص زندگی کی پیچیدگیوں اور تضاد سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس عمل کا زندانی ہے لیکن کونٹنٹ کے شاعر کا مسئلہ اور ہے۔ محمد سلیم الرحمن کے مقالے کا عنوان تھا "پیٹرن آف مرر" لیکن یہ کتاب کوئی کلیڈیوسکوپ نہیں جن میں آئینوں کے پیٹرن بنتے ہیں۔ آئینہ خانے سے تو انفنیٹی کا تصور ابھرتا ہے۔ جب دو آئینے ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیئے جائیں تو وہ تا حد نظر ایک دوسرے کو منعکس کرتے چلے جاتے ہیں اور اس انعکاس کی حد اگر کوئی ہے تو وہ انفنیٹی ہے۔ چنانچہ اردو شاعری میں آئینہ خانہ بکثرت انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے گو اس سے مراد یہ نہیں کہ یہ تعبیر کسی دوسری تعبیر یا تعبیروں کی نفی کرتی ہے۔ چنانچہ جب غالب کہتا ہے کہ:

مدعا محو تماشائے شکستِ دل ہے　　آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

تو اسی انفنیٹی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

"آئینہ خانہ" کے اس پہلو پر جب جناب اختر حسین جعفری سے سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا: آئینہ خانہ بنیادی طور پر ایک طویل نظم ہے اور پڑھنے والے کو پہلی نظر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ اس عنوان کے محرکات میں مندرجہ بالا شعر کارفرما ہوگا لیکن یہ کہنا حقیقت کے زیادہ قریب ہوگا کہ اس نظم کی تحریک مجھے غالب کے اس شعر سے ملی:

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

نظم کے شروع کا ایک بند اس طرح ہے:

اٹھائے کون حجاباتِ شاہد و مشہود
کہاں کسی پہ طلسمِ پسِ نگاہ کھلا
بتائے کون کہ کاغذ کی سطحِ خالی پر
بغیر حرف بھی نکتہ وجود رکھتا ہے
وہ قتل گاہ کہاں ہے جہاں پہ لفظوں نے
فراقِ حسنِ تمنا میں خودکشی کر لی
ہجومِ راہ گزر منتظر ہے کس کے لئے
سحر ہوئی تو درِ نیم وا پہ قفل پڑا
چلی صبا تو پہاڑوں نے راستہ نہ دیا
جواں ہوئیں تو گھروں سے نہ لڑکیاں نکلیں

الفاظ کا یہ انتخاب، ان کی یہ تنظیم، ان کی یہ نشست و برخاست اگر غالب سے متاثر ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔

جعفری صاحب نے بات جاری رکھی اور کہا کہ غالب کے بعد اقبال تک آکر شاعری کا ایک دور ختم ہو گیا۔ اس کے بعد آنے والے دور میں شعری احساس یا سینسیبلیٹی میں خصوصاً نظم میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔ سب سے بڑی تبدیلی نظم کے فارم میں آئی۔ اس تبدیلی کا آغاز راشد کی "ماورا" سے ہوا۔ اصوات کو بحروں کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ ہماری شاعری کی روایتی بحریں تھیں۔ راشد اور میراجی کے زمانے میں ان میں تبدیلیاں واقع ہونا شروع ہوئیں۔ نظم کی فارم بدلنے کا تقاضا تھا کہ نظم کی کونٹنٹ میں بھی تبدیلیاں ہوں۔ اس زمانے میں شاعروں نے اصوات کے روایتی پیٹرن کو توڑا اور نئے اوزان استعمال کرنے شروع کئے۔ اس عمل میں شاعر نے اپنے آپ کو آزاد خیال کیا۔ چنانچہ اصوات وہی رہیں، بحور وہی رہیں لیکن اوزان کے استعمال میں آزادی برتی گئی اور ان میں حسب مرضی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ بحر کا مجموعی ہنگام قائم رکھتے ہوئے کہیں ایک آدھ رکن بڑھا دیا اور کہیں ایک آدھ رکن کم کر دیا۔ یوں نظم کی فارم اور کونٹنٹ دونوں میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔

جعفری صاحب نے بتایا کہ شاعری کی اس تبدیلی کی وجوہات میں وہ محرکات پیش پیش تھے جو باہر سے درآمد کئے گئے۔ کچھ لوگ بیرونِ ہند سے پڑھ کر آئے تھے۔ ان کا یورپی ادب خصوصاً انگریزی ادب کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ ان لوگوں نے اپنی زبان میں ہیئت کے تجربات شروع کر دیئے۔ ان تجربات کے ذریعے بلینک ورس نے بھی اردو نظم میں اپنا مقام بنایا۔ اوزان اور ارکان کے دلیرانہ تجربات کے زیر اثر اردو زبان کے شاعرانہ شعور میں ایک انقلاب برپا ہو گیا جو نظم کی ہیئت اور اس کے کونٹنٹ میں ظاہر ہوا۔ اور شعر کے شعور میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی۔

جعفری صاحب نے کہا کہ راشد کے ہاں مضامین اقبال سے مختلف ہیں اور ان کے اظہار کا انداز بھی مختلف ہے۔ فیض نے شاعری کا پیٹرن تو کم و بیش وہی رکھا اور اس میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہ کی لیکن وہ بھی شاعری کے مضامین میں تبدیلیاں ضرور لائے۔ "اے روشنیوں کے شہر" "آجاؤ افریقا" ان تبدیلیوں کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ انھوں نے کلاسزم کو جدید فارم میں لا کر شاعری کا پیٹرن نیو کلاسزم کے حوالے سے بنایا ہے۔ راشد اور میراجی کے ہاں فارم کے تجربات زیادہ ہیں۔ یہ تبدیلی پچاس ساٹھ سالوں پر محیط ہے جو کسی ادبی تجربے کے لئے زیادہ وقت نہیں۔ تبدیلی بڑی آہستہ آہستہ آئی لیکن اسے محسوس بڑی شدت سے کیا گیا۔

اس شعری شعور میں جو تبدیلی ہوئی، اس کے محرکات میں علاوہ بیرونِ ملک تعلیم کے، دو بڑی عالمی جنگیں، مواصلات میں ترقی جس نے دنیا کے جسمانی اور ذہنی فاصلوں کو بہت کم کر دیا ہے، دوسری زبانوں کے تراجم کی آسانی سے دستیابی نمایاں ہیں۔ ان نئے حالات کی وجہ سے ان

ممالک میں ادبی رجحانات سے انسان آگاہ ہونا شروع ہوگیا۔ برٹش کونسل یا امریکی سنٹر کا ایک چکر لگانے سے ان سب تبدیلیوں اور تحریکوں سے انسان متعارف ہوجاتا ہے جو دنیا میں اس وقت رونما ہو رہی ہیں۔ ان پچاس ساٹھ برسوں میں ان محرکات کی بنا پر شعر کی دنیا یکسر بدل چکی ہے۔ اظہار کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ اب غالب اور اقبال والا عہد نہیں رہ گیا۔

جعفری صاحب کے خیال میں نہ صرف شعر کے کوائنٹ میں تبدیلی آئی ہے بلکہ شاعری کا طریق کار بھی بدل گیا ہے۔ ہمارے ہاں طویل نظم ایک نیا تجربہ ہے۔ یہ آزاد نظم ہی کی توسیع ہے۔ اس میں شعری فضا وہی ہے۔ اصوات کا پیٹرن بھی وہی ہے۔ ہر لفظ موسیقیت کا ایک پیٹرن رکھتا ہے۔ اس کا اپنا ایک مخصوص آہنگ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے ہم نے اگر آزاد نظم کا تجربہ کیا ہے تو ہم شاعری کا رجحان بدلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اور شاید نثری نظم جسے کچھ لوگ ابھی تک شاعری ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں ایک دن ایسی ہی تبدیلیاں لے آئے۔

جعفری صاحب نے کہا کہ اس نئے شعری احساس سے کئی شاعر زیادہ متاثر نہیں ہوئے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں پوری طرح متاثر ہوا ہوں۔ میری تخصیص نظم ہے۔ دیگر اصناف سخن کو میں نے نہیں اپنایا۔ شروع سے ہی میری غزلوں سے یہ احساس ہوگا کہ شاعر یہاں کسی مجبوری کا شکار ہے اور اپنے بیان کے لئے اسے اور وسعت درکار ہے۔ غزل میں یہ شاعر اپنے آپ کو ایٹ ہوم محسوس نہیں کرتا۔ یہ نہیں کہ میں نئے شعری شعور سے واقف نہیں اور مجھے غزل کہنے میں دقت ہوتی ہے بلکہ معاملہ کچھ یوں ہے کہ جب میں نظم کہتا ہوں تو مجھے ایک آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے گھر میں ہوں جس کے در و بام سے میں پوری طرح واقف ہوں۔ شاعری تو بنیادی طور پر شاعری ہی ہے جو اچھی غزل میں بھی ہوجاتی ہے اور اچھی نظم میں بھی۔

جعفری صاحب نے بتایا کہ بحیثیت ایک شاعر کے میں نے شاعری میں ایک ذاتی انوالومنٹ محسوس کی ہے۔ ستائش اور صلے سے قطع نظر میں باقی شاعروں سے اسی لئے مختلف ہوں کہ شاعری سے میری ذاتی انوالومنٹ باقیوں سے مختلف ہے۔ میں نے اپنے آپ کو شاعری کی ایک صنف سے وابستہ کیا۔ میری صنفِ سخن میں انوالومنٹ ایسی ہی ہے جیسے ایک موجد کی جب وہ کوئی چیز ایجاد کر رہا ہوتا ہے۔ ایسی انوالومنٹ باقی لوگوں کی انوالومنٹ سے مختلف ہوتی ہے۔ "آئینہ خانہ" میں کل بارہ نظمیں ہیں۔ ہر نظم کی فارم مختلف ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ میں نے شعوری طور پر بالالتزام یہ کوشش کی ہے کہ ہر نظم کی فارم منفرد ہو۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک صاحبِ شعور اور باخبر کا نشسِ فن کار یہ سمجھتا ہے کہ وہ فن میں کچھ تبدیلی یا تبدیلیاں لایا ہے لیکن یہ احساس موضوعی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ نقادوں کا کام ہوتا ہے کہ وہ اس امر کا کھوج لگائیں کہ کیا فن کار نے واقعی تبدیلی کے لئے شعوری کوشش کی ہے اور اگر ایسا ہے تو وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ قارئین نے ایسا محسوس کیا ہوگا کہ آئینہ خانے میں فارم کے مختلف تجربات کئے گئے ہیں۔ میری شعوری کوشش یہ رہی ہے کہ ہر نظم کا سابقہ نظم سے پیٹرن مختلف ہو۔ "آئینہ خانہ" کی پہلی نظم "اے میرے غم" آگے آنے والی نظم "امتناع کا مہینہ" کی فارم اور اظہار دونوں میں مختلف ہے۔ نظم "سولی سے عیسیٰ اترے" بھی فارم اور اظہار میں آنے والی نظم "غیر محفوظ رات سے ڈرتا ہوں" سے مختلف ہے۔ "ستارے اہلِ حق کے ساتھ ہیں" کا فارم بھی بالکل علیحدہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح "تیرا پیار ترا کیسا"، "نوحہ"، "سالنامہ" یا "امتناع کا مہینہ" اور باقی نظمیں ایسی ہیں جو فارم کے تجربات کی مظہر ہیں اور ان تجربات اور ان کے پیچھے تلاش کے جذبے کی کارفرمائی سے یوں معلوم ہوگا کہ شاعر خود اپنی ذات کی تلاش میں ہے۔

ایسے تجربات ہمیں اقبال کے ہاں بھی اس کی فارسی اور اردو شاعری دونوں میں ملتے ہیں۔ اقبال غالب کا جانشین تھا اور اسی طرح غیر مقلد بھی۔ چنانچہ اپنے اس موقف کی بنا پر فارم اور ہیئت کے ایسے تجربات گویا اس کے اعتقادات کا حصہ تھے لیکن اقبال کے ہاں یہ تجربات ہی تھے۔ شاید یہی اس زمانے کا تقاضا تھا اور اس عہد میں بس اتنی ہی تبدیلی ممکن تھی۔ اقبال کے پیٹرن کو جوش نے استعمال کیا۔ جوش کی

پیتیس چھتیس شعروں کی غزل اقبال کی یاد دلاتی ہے (کیسے۔ یہ نقطہ وضاحت چاہتا ہے) لیکن راشد کے ہاں یہ تجربہ ایک انقلابی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اقبال کا شمار آفاقی شاعروں میں ہوتا ہے لیکن راشد درمیانے درجے کا شاعر ہے۔ ان تجربات میں راشد دوسرے شاعروں کے مقابلے میں بشمول اقبال کے بہت آگے ہے۔ لیکن اقبال کو جس نے یہ تجربات شروع کئے تھے، اس کے حصے سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کی شاعری میں نظم کی ایک مرکزی حیثیت تھی، اور نظم کا سایہ اقبال کی غزل پر بھی پڑا۔ اقبال کی بیشتر غزلیں ایسی ہیں جن پر غزل کی روایتی تعریف منطبق نہیں ہوتی کیونکہ اس میں گل و بلبل اور محبوب کی وفا اور بے وفائی یا لب و رخسار کا ذکر موجود نہیں۔ ان میں اسرارِ مرگ و حیات، اللہ اور بندے کا تعلق، انسانی زندگی اور اس کے مختلف پہلو موضوعِ سخن بنتے ہیں۔ "بالِ جبریل" کی پہلی دس بارہ غزلیں اور باقی ماندہ غزلیں اقبال کی جدت پسندی کے تحت روایتی غزل سے مختلف ہیں اور یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے اردو اور فارسی غزل کو ایک نئے بُعد سے روشناس کیا۔ لیکن ایسا صرف اس لئے ممکن ہوا کہ اس کی شاعری میں نظم مرکزی اہمیت رکھتی ہے چنانچہ بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدید اردو شاعری میں ہیئت کی تبدیلیوں میں اقبال ایک امام کا درجہ رکھتا ہے۔ راہ اسی نے دکھائی، اس راہ پر سب سے آگے چلنے والا راشد ہی تھا۔

ندیم نے بھی شاعری میں فارم کے تجربوں میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ نظم کے متعلق اس کا ایک مخصوص رویہ ہے جو "جلال و جمال"، "شعلۂ گل" اور "دشتِ وفا" میں قائم ہے۔ "جلال و جمال" اور "شعلۂ گل" تک وہ بنیادی طور پر وہ نظم کا شاعر ہے۔ ان مجموعوں میں اس کی بڑی بلیغ نظمیں ملتی ہیں۔ اور ان میں وہ نظم کا سرکردہ شاعر ہے۔ ہمارے ترقی پسند ادب میں ندیم کی نظمیں اپنی بلاغت کی وجہ سے بڑی منفرد ہیں (اور پھر ترقی پسندی کے حوالے سے ہی ساحر کی نظموں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔) ندیم کہتا ہے:

روٹیاں بوٹیوں سے تلتی ہیں
عصمتوں کی سجی دکانوں پر
پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے
خون کا ذائقہ زبانوں پر

جہاں تک تجربے کا تعلق ہے تو طویل بحروں میں ندیم نے نظمیں کہی ہیں ... چھوٹوں پر کہیں گہرے گہرے کہیں ہلکے ہلکے .... عجیب و غریب نظمیں ہیں۔ یہ دور "دشتِ وفا" کے بعد تک چلتا ہے۔ یہ اس نے "دشتِ وفا" کے بعد لکھا ہے کہ "ہوا لہروں پہ لکھتی ہے تو پانی ریت پر تحریر کرتا ہے" یہ ایک بھرپور نظم ہے۔ "شعلۂ گل" اور "جلال و جمال" تک اس نے غزل میں بھی کمال دکھایا ہے اور اس کا تجربہ غزل میں بہت زیادہ ہے۔ مثلاً

بگاڑ ہو کہ بناؤ عجیب تیرے سبھاؤ
نگاہوں میں ہیں بلاؤ تو ابروؤں میں تناؤ

میں اپنے آپ سے شب بھر کلام کرتا رہا

وہ رات بیت چکی ہے وہ رات بھول بھی جاؤ

اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ندیم کی نظم ندیم کی غزل پر حاوی ہے۔ جب "دشتِ وفا آئی تو "کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی" کے ساتھ ندیم کی غزل میں ایک نیا بُعد پیدا ہوتا ہے۔ غزل بالغ (میچیور) ہوتی ہے اور یہ عمل "دشتِ وفا" کے بعد شروع ہوتا ہے۔ غزل کی اپنی دنیا ہے اور یہ بھی طلسمات کا اتنا بڑا کارخانہ ہے جتنا کہ نظم کا ہے۔ غزل بھی شاعر کی اتنی ہی انوالومنٹ کا تقاضا کرتی

ہے جتنا کہ نظم۔ اور

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصر
یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

اس بنا پر بھی ندیم کا کام ایک حقیقی تخلیقی کام ہے۔

جعفری صاحب نے بتایا کہ نظم ابھی اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے۔ اس میں نئے خیالات، نئے جذبات، نئے موضوعات اور نئے احساسات کی بہت گنجائش ہے جبکہ فارم کے لحاظ سے غزل ایک محدود ذریعہ ہے۔ یہ ذریعۂ اظہار تجربات سے بھرپور ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اس میں ضرورت سے زیادہ تجربات ہوئے ہیں۔ نئے موضوعات کی گنجائش اس میں ہمیشہ رہی ہے۔ نئی دنیائیں، نئے آفاق، نئے سورج، نئے چاند اور نئے ستارے آدمی اسی فارمیٹ میں تلاش کر سکتا ہے۔ لیکن اپنی فارم کے لحاظ سے غزل ایک واقعی محدود صنف ہے۔ غالب کا اس ذریعۂ اظہار کو "تنگنائے غزل" کہنا ایک ایسا فتویٰ ہے جو اپنے اندر ایک پیغمبرانہ بصیرت رکھتا ہے۔ جہاں میر اور غالب جیسے "جنات" موجود ہوں اور ان کے بلند و بالا ہمعصر بھی موجود ہوں اور پھر ان کے بعد آنے والے اقبال جیسے آفاقی شعرا بھی دندنا رہے ہوں، وہاں کچھ کر دکھانا ایک کارنامہ ہی ہو سکتا ہے اور یہ کارنامہ ندیم نے کر دکھایا ہے لیکن ندیم بنیادی اور لازمی طور پر نظم کا شاعر ہی رہا ہے۔ اور آج بھی وہ بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہی ہے۔

مجید امجد بھی بنیادی طور پر نظم ہی کا شاعر ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اگر کوئی پُرخلوص طریقے سے نظم سے وابستہ رہا ہے تو وہ مجید امجد ہی ہے۔ وہ خود کہتا ہے:

خوابوں کے اس کوہ گراں سے
میں نے تراشی نظم کے ایوان کی ایک صنف

راشد اور میراجی کے بعد مجید امجد واحد شاعر ہے جس نے کلی طور پر اپنے آپ کو نظم کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اپنی شعری بصیرت اور شعری شعور کا اظہار وہ صرف نظم کے ذریعے ہی کرتا ہے۔ ناصر کاظمی بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔

غزل اور نظم کے رشتے کے بارے میں ایک عجیب تاثر یہ ہے کہ دلی سے اِس طرف کے شاعروں کے لئے نظم اتنی پُرکشش ثابت نہیں ہوئی۔ ان شاعروں کو شعر کی زبان سیکھنے میں بڑا وقت لگ جاتا ہے لیکن دلی اور اُدھر کے شعرا کو تو تیار زبان پالنے سے مل جاتی ہے اور انہیں اس معاملے میں اتنا تردد نہیں کرنا پڑتا۔ بولنے کی زبان، لکھنے کی زبان اور شاعری کی زبان کی سطحیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں اور ان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ دلی والوں کو محاورہ اور روزمرہ بنا بنایا مل جاتا ہے جبکہ اِدھر کے شاعروں کو وہ خود گھڑنا اور تراشنا پڑتا ہے۔ اقبال کا گرامی کو یہ اطلاع دینا کہ "شعر ہو گیا ہے لیکن ابھی خراد پر نہیں چڑھا" اسی وقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اقبال کے علاوہ مجید امجد اور راشد بھی اس مسئلے سے دوچار رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ان تمام شاعروں کا مسئلہ ہے جو دلی سے اِس طرف ہیں۔ لیکن دلی اور اس کے نواح والوں کا ہمیشہ زبان پر اصرار رہا ہے۔ یوں ناصر کاظمی کے لئے غزل کا معرکہ آسان رہا ہے۔

جنگ عظیم، دنیا کے سکڑنے وغیرہ جیسے عوامل جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ میرے ہمعصر شاعروں کی طرح مجھ پر اثر انداز ہوئے۔ تعلیم کے دوران میں جس کا اثر گھر کے ماحول کی طرح انسان پر ہمیشہ رہتا ہے، میں اپنے اساتذہ اور تعلیمی ماحول سے بڑا متاثر ہوا۔ وہ یوں کہ مجھے نظمیں یاد کرانے والا ماسٹر بیلا رام آج بھی یاد ہے۔ میں سکول کا ایک ہوشیار طالب علم تھا۔ اردو نظم و نثر سے اسے خاص لگاؤ تھا۔ شعر کہنا میں نے دیر سے شروع کیا۔ یعنی اس وقت جب میں سترہ اٹھارہ سال کا تھا اور ذہنی طور پر بالغ ہو چکا تھا۔ میری پہلی کاوش انگریزی

کی نظم "گیدر ین دی رود بڈز" (Gather ye the Rose Buds) کا ترجمہ تھا۔ یعنی میرا شعری آغاز ہی انگریزی ادب سے ہوا۔ یہ ترجمہ کالج میگزین میں چھپا۔ ایک آزاد نظم بھی شائع ہوئی۔ ان دنوں میں ترقی پسند شاعروں سے بہت متاثر تھا۔ فیض، ندیم اور ساحر میرے ماڈل تھے اور میری نظر میں ان سے بڑا اور کوئی شاعر نہ تھا۔ میں سال ۱۹۶۴ء تک اپنے لئے راستے کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ مجھے راستے نہیں ملتے تھے۔ اس سال تک جو نظمیں میں نے کہیں وہ تعداد میں ۳۲ یا ۳۳ ہوں گی۔ وہ "آئینہ خانہ" میں شامل نہیں ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میں فیض کی زبان بولتا تھا یا ندیم کی زبان میں شعر کہتا تھا تو ایسے احساس ہوتا تھا کہ میرے اندر فیض یا ندیم بول رہا ہے لیکن میں جس آدمی کی تلاش میں تھا وہ مجھے نہیں مل رہا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا۔ جب میں نے فیض کے لہجے میں بات کی تو میں نے فیض کو تلاش کیا اور جب ندیم کا لہجہ اختیار کیا تو میں ندیم کو تلاش کر رہا ہوتا تھا۔ چنانچہ مجھے اپنی تلاش میں کافی عرصہ لگا۔

جب ۱۹۷۴ء میں میری پہلی نظم "فنون" میں شائع ہوئی تو یکدم شور اٹھا کہ یہ بڑی اچھی نظم ہے۔ یہ نظم ایذرا پاؤنڈ کا مرثیہ تھی:

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں

یہ وہ وقت تھا جب میں شاعر اختر حسین جعفری کی تلاش میں نکلا۔ یہ تلاش ابھی جاری ہے۔ میں جب کوئی نظم دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو پہلے بھی کہا جا چکا ہے اور یہ وہ نہیں جو کہا نہیں گیا۔ غالب نے کہا تھا:

اسدؔ اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش

لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

تو اس کے ذہن پر نئے نئے مضامین نازل ہوتے تھے لیکن اختر حسین جعفری اب بھی تلاشِ ذات میں ہے اور یہ کام شاید ساری زندگی جاری رہے۔ جس نظم پر مجھے داد مل جاتی ہے تو بعض اوقات ایک طرح کی طمانیت ہوتی ہے لیکن ساتھ خدشہ بھی ہوتا ہے کہ:

شعر افتد قبول خاطر و عام

خاص داند سست باشد و خام

بات یہ ہے کہ جب میرے اندر تبدیلی آئی ہے جیسے کوئی آدمی کسی کی تلاش میں ہو تو میں کبھی کسی کے حوالے سے تلاش کرتا ہوں اور کبھی کسی اور کے۔ لیکن تلاش ضرور کرتا ہوں۔ اس عہد میں تبدیلی آئی تو ایبسٹریکشن کے حوالے سے یا امپریشن ازم کے حوالے سے لوگ شاعری کرنے لگے۔ امپریشن ازم کی کئی شکلیں ہیں: ٹوٹل ایبسٹریکشن ازم، سیوڈو ایبسٹریکشن وغیرہ وغیرہ حالانکہ ورس لیبرے (Verse Libre) میں ایذرا پاؤنڈ اس کا قایل نہیں مگر ویسٹ لینڈ (Waste Land) کا شاعر ایلیٹ قایل ہے۔ پاؤنڈ کے ہاں تنقید کا یہ اصول ہے کہ "میک اٹ نیو" (Make it New) یعنی مصرعے کو نیا بناؤ۔ اور اب جو یہ ان کہی یعنی آن سیڈ (Unsaid) کی بات کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امیج سازی کی جائے، پیکر سازی کی۔ پیکر سے گفتگو کرانا یعنی ایک منظر گفتگو کرے۔ مکالمہ منظر کے منہ میں داخل کرو اور پھر یہ ہے کہ میک اٹ نیو۔ ۱۹۶۴ء سے جب میں نے اپنا سفر شروع کیا تو میرے سفر کا راہنما اصول یہی تھا جبکہ پاؤنڈ کا تجربہ ڈائرکٹ کمیونیکیشن کا ہے۔ یہ درست ہے کہ کینٹوز (Cantos) کے بارے میں کچھ کنفیوژن ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایلیٹ سے متاثر ہوا ہوں جس کی وہ تصحیحیں کرتا رہا ہے۔ اس کی کچھ مختصر نظمیں ہیں اور جن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ چینی نظموں کے تراجم ہیں لیکن پاؤنڈ نے اس بات کا اقبال نہیں کیا کیونکہ اس نے خود کہا کہ اوریجنیلٹی دراصل چھپانے کے فن کا دوسرا نام ہے یعنی تم اپنے ان ماخذوں کو چھپاؤ جن سے تم انسپائر ہوئے۔

میں اپنے ان ماخذوں کو نہیں چھپاتا۔ جب آدمی راستہ تلاش کر رہا ہوتا ہے تو وہ اِدھر اُدھر نظر مارتا ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتا

ہے وہ اس سب کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح وہ ملے جلے اثرات کے تحت آجاتا ہے۔ مجھ پر جن لوگوں کا اثر ہے وہ بعد کے ہیں۔ میں نے اطالوی شاعروں کو پڑھا ہے۔ ایگ لنڈ کو پڑھا ہے، پابلو نرودا کو پڑھا ہے لیکن ان کے عمل تخلیق کے میدان (Areas) جداگانہ ہیں اور ان کی فضائیں اتنی مختلف ہیں جیسے براعظم مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان کے کچرل فاصلے بھی زیادہ ہیں۔ وہ اپنی فارمز وضع کرتے ہیں اور ہم اپنی فارمز وضع کرتے ہیں۔ ہماری فارمز ہمارے برعظیم سے متعلق ہوتی ہیں اور پھر اظہار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اردو شاعری اور اردو ڈکشن کے اندر رہو جو خود بہت بڑی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ "آئینہ خانہ" میں پرشیانائزیشن ہے اور فارسی ترکیبیں ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ فارم کی تبدیلی کے ساتھ زبان میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور نئی زبان تخلیق ہوتی ہے۔ اقبال کی شعری زبان غالب کے ہاں نظر نہیں آتی۔ اس کی اپنی زبان ہے چنانچہ جب کونٹنٹ اور فارم تبدیل ہوتی ہیں تو اس کے ساتھ زبان بھی نئی تخلیق ہوتی ہے یا کرنی پڑتی ہے۔ اور اگر کوئی شاعر یہ نہ کر سکے تو وہ کوئی بڑا شاعر نہیں بن سکتا۔

میں یہ نہیں بتا سکتا کہ جن شاعروں سے میں متاثر ہوا ہوں میرے ہمعصر بھی ان لوگوں سے متاثر ہوئے ہیں یا نہیں۔ دنیا بہت سکڑ گئی ہے اور ہمارے شاعر ان سب لوگوں کو جانتے ہیں۔ جاوید شاہین نے اوکتاویو پاز کے تراجم کئے اور وہ شائع بھی ہوئے ہیں لیکن اثر پذیر ہونا ایک بات ہے، ترجمہ کرنا دوسری بات ہے، پڑھنا الگ عمل ہے۔ لیکن باہر جو کچھ ہو رہا ہے اسے اپنے تجربے کا حصہ بنانا، اسے ری پروسس (Reprocess) کر کے دوبارہ ری جنریٹ (Regenerate) کرنا دوسری چیز ہے۔ مثال دھاگے کی ہے جو بجائے خود ایک چیز ہے لیکن جب اس سے بیگ بنائے جاتے ہیں تو وہ ایک مختلف چیز بن جاتا ہے گو وہ بیگ دھاگے ہی کا بنا ہوتا ہے۔ دھاگے کی ذات اور ان سے بنائے ہوئے بیگ میں بڑا فرق ہے۔ تجربات کا سرچشمہ کہیں سے آرہا ہو، جو مال میرے اندر سے برآمد ہوتا ہے وہ سراسر دیسی مال ہے۔ میرے شعر تخلیق کرنے کا عمل اپنی ہی روایت کی توسیع ہے۔

شاعری کے لئے یا کسی بھی ہنر کے لئے وسیع المطالعہ ہونا بہت ضروری ہے۔ ذہنی افق مطالعہ سے ہی وسیع ہوتے ہیں غالب، کو دیکھیں اور ذوق کو دیکھیں۔ غالب ذوق کے مقابلے میں کتنا وسیع المطالعہ تھا۔ مطالعہ سے آگاہی میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ سوچ خیال کو متاثر کرتا ہے۔ میرے ہمعصر بھی جو "فنون" میں چھپتے ہیں خاصے وسیع المطالعہ ہیں لیکن تخلیقی عمل میں ان کے مطالعہ کے اثرات کا اظہار مختلف طریقوں اور مختلف سطحوں پر ہوتا ہے۔ میں اگر آج فیض کو ریپیٹ کروں تو میری شعری ذات کا اظہار نہیں ہوگا۔ پڑھنا اور آگاہ ہونا بے حد ضروری ہے لیکن متاثر ہونے اور اس تاثر کو قائم رکھنے سے شعری شخصیت نہیں ابھرتی۔ ایک نقاد کو اپنی پسند اور ناپسند کے سبب کا پتہ ہوتا ہے۔ میری نظر میں ایک نقاد اصلی قاری ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک قاری جو نقاد نہیں، ایک سطحی قاری ہے۔ اکثر شاعر اپنے قاری کو متاثر کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی اپنی پسند اور ناپسند ہے۔

جہاں تک اثر پذیر ہونے کا تعلق ہے تو اسے ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ جب میں نے مصحفی کا یہ شعر پڑھا یا سنا کہ

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم — تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا!

تو میری یہ نظم تخلیق ہوئی:

واماں صبا صد کارِ رفو
چشمِ سوزن میں جمع لہو
سے تار نکالیں لیلائیں

چنانچہ مصطفیٰ میرے اندر سے یوں برآمد ہوا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اس شعر کی فضا غزل کی ہے اور اس کے تمام تلازمات بھی غزل کے ہیں جبکہ میں نے ان جذبات کا اظہار نظم میں کیا ہے۔ "تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا" ایسا مصرعہ ہے جو دل کے اندر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن میرے اندر سے یہ تجربہ برآمد ہوتے وقت ایج کی تھوڑی سی توسیع ہو جاتی ہے کہ "چشم سوزن میں جمع لہو سے تار نکالیں لیلائیں" یعنی جنہیں رفوگری کرنی ہے وہ رات رات بھر خون کے آنسو روتی رہی ہیں جس سے رفو کے لئے انھیں تار بھی کھینچنے پڑتے ہیں۔ یہ اس وقت کی نظم ہے جب بھٹو صاحب ابھی اندر ہوئے تھے اور فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا اور یہ خیال تھا کہ یہ سلسلہ بہت لمبا چلے گا،

کیا زرد شجر کو خط بھیجیں
کیا اس موسم سے میل کریں
جس کے مہتاب تہہ دریا جس کے سورج گرداب میں ہیں
جس کے انجم کشتی کشتی، ساحل ساحل زنجیر ہوئے

دامانِ صبا، صد کارِ رفو
چشمِ سوزن میں جمع لہو سے تار نکالیں لیلائیں
بخیہ بخیہ درہم مانگے، پیراہن جن کے رہن ہوئے
کیا ان شاخوں سے بات کریں
کیا میل کریں
کیا خط بھیجیں

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ شاعری کے لئے ابلاغ ضروری نہیں لیکن کام کا مطلب ہی گفتگو کرنا ہے اور اگر گفتگو کچھ بتاتی نہیں، کچھ کمیونیکیٹ نہیں کرتی تو پھر یہ گفتگو نہیں ہے۔ شاعری تو باقی طرزہائے گفتگو کی طرح جیسے ڈرامے کی گفتگو، شعری گفتگو ہے۔ اس کا مقصد ہی ابلاغ ہے۔ اور اگر کوئی فن پارہ ابلاغ نہیں کرتا تو وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر صنف سخن کی حدود، اس کا فورم اور اس کی شرائط مختلف ہوتی ہیں۔ افسانے کو اپنی ٹکنیک میں ابلاغ کرنا ہے۔ شاعر کو بھی ابلاغ کرنا ہوتا ہے لیکن اپنے پیٹرن میں۔ اور شاعری کی اپنی اصناف نے اپنے اپنے مخصوص حدود میں ابلاغ کرنا ہے۔ غالب کب ابلاغ نہیں کرتا؟ لیکن سوال یہ ہے کہ اس نے تمام لوگوں سے ابلاغ کرنا ہے یا اپنے عہد کے لوگوں سے ابلاغ کرنا ہے؟ پھر اگر بات کرنی ہے تو یہ بھی دیکھنا ہے کہ جو بات کہنی ہے وہ کس آدمی کے پلے پڑتی ہے اور پھر یہ سوال بھی ہے کہ بات کہنی بھی ہے کہ نہیں۔ غالب اپنے زمانے میں ان لوگوں سے، ابلاغ کا رشتہ استوار نہیں کر سکا اور وہ سب کہتے تھے کہ وہ اپنا کہا خود آپ تجھیں یا خدا سمجھے، لیکن آج شاعری کی کوئی بات بھی اس کے حوالے کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ وہ اس زمانے میں بھی ابلاغ کرتا تھا اور آج بھی کر رہا ہے۔ چنانچہ ابلاغ شعر کی بنیادی شرط ہے۔ لیکن ابلاغ کی کئی سطحیں ہیں۔ ان میں سے لطیف ترین سطحیں ایسی بھی ہیں جن کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔

شعری ابلاغ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قاری پر شعر ایک بے نام سا ایسا تاثر چھوڑ دے جس کا بیان عام الفاظ میں مشکل ہو یا ناممکن ہو۔ یہ ایک کیفیت ہے جہاں لفظ اور معانی کا رشتہ معطل ہو جاتا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت موسیقی کے حوالے سے بھی کی جا سکتی

ہے۔ موسیقی آواز یعنی صوت کا فن ہے۔ اس میں الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں اور جو لفظ گائے جاتے ہیں وہ محض آواز کے زیر و بم کو سہارا دینے کے لئے ہوتے ہیں۔ موسیقار الفاظ کی ترسیل سے نہیں بلکہ وہ اپنی آواز کے زیر و بم سے ایک سامع کو ایسے داخلی تجربے سے دوچار کراتا ہے جسے ہم ایک کیفیت ہی کہہ سکتے ہیں جس کو سامع صرف محسوس ہی کر سکتا ہے لیکن الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کیونکہ وہ تجربہ الفاظ کی اقلیم سے ماورا ہوتا ہے۔

دوسری مثال صوفی تجربے سے لے سکتے ہیں۔ یہ بھی ایک سالک کا داخلی تجربہ ہے اور اس کے اظہار کے لئے بھی ابھی الفاظ وضع نہیں ہوئے اپنے تجربے کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکنے کی بنا پر اس تجربے کو کبھی بناوٹ یا تلبیس اور کبھی روحانیت کا نام دے دیا جاتا ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسا تجربہ ممکن ہے اور ہوتا ہے۔

مرئی سطح پر تاج محل کو دیکھیں۔ اس کی تعریف و توصیف میں دفتروں کے دفتر وجود میں آ چکے ہیں۔ ہر پہلو سے اس کا جائزہ لیا جا چکا ہے لیکن اس عمارت کا سحر گرفت میں نہیں آ سکا۔ اس سحر کا تعلق بھی ایک داخلی تجربے سے ہے جس سے انسان اس وقت دوچار ہوتا ہے جب وہ اسے خود دیکھتا ہے۔ اسی تجربے کی طرف ایک قادر الکلام شاعر صرف اشارہ کر سکا ہے کہ "تاج را در زیر مہتاب نگر" اس سے زیادہ وہ بھی اس تجربے کو بیان نہیں کر سکا۔

پیرس کے لوور مین لیونارڈو داونچی کا شاہکار "مونا لیزا" آویزاں ہے۔ یہ تصویر بھی ایک ابلاغ کرتی ہے جو الفاظ کی گرفت سے ماورا ہے۔ لوگ میوزیم کے کھلنے پر ہی اس کو دیکھنے لگتے ہیں اور بند ہونے تک صم بکم اس تصویر کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں اور جب ان سے پوچھا جائے کہ انھوں نے کیا دیکھا تو ان کے پاس سوائے خاموشی کے اور کوئی جواب نہیں ہوتا۔ وہ اس تجربے کو بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

مادی سطح پر بھی انسان ایسے ہی تجربے سے دوچار ہو چکا ہے۔ خلا میں ورود کے پہلے مشن سے واپس آنے والے ایسٹرونالٹس بھی ایسے ہی تجربے سے دوچار ہوئے۔ انھوں نے بیرونی فضا میں ایسے ایسے طلسماتی رنگ دیکھے جن کو وہ بیان کرنے سے قاصر رہے۔

شاعری الفاظ کی جادوگری ہے۔ یہ گویائی کی معراج ہے اور "برہنہ حرف نگفتن کمال گویائیست"۔ حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست" شعر اسی رمز و ایما کا مرقع ہے جس کے مخاطب صرف وہ لوگ ہیں جو اس کے سحر سے آشنا ہیں۔ ورنہ گالی بھی تو گویائی ہی ہے اور وہ بھی لطیف اور بلیغ ہو سکتی ہے، یعنی ان صفات کی حامل جو شعر اور الفاظ کی اقلیم سے مخصوص ہیں۔ لیکن وہ حرفِ برہنہ ہونے کی وجہ سے فن کی دنیا سے خارج ہے مگر اس امر کا امکان ہے کہ گالی کو بھی ایک شاعر اپنی طلسم آفریں قوت سے ایک فنِ لطیف بنا دے۔ مثالیں دینے کی گنجائش نہیں صرف اردو ادب میں ہزلیات پر نظر ڈال لینا اس نکتے کی افروزی کے لئے کافی ہوگا۔

چنانچہ ابلاغ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قاری اس "فضا" یا اس "کیفیت" کی گرفت میں آ جائے جس سے شاعر شعر کہتے وقت خود دوچار ہوا تھا اور جو اس نے الفاظ کے استعمال سے تعمیر کی۔ ایسی کیفیت کی تشریح روزمرہ استعمال ہونے والی زبان میں ممکن نہیں، شاید ایسے ہی ابلاغ کی جستجو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی کر رہے تھے، جب وہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی "زبان کی گرہ" کھولنے کی التجا کر رہے تھے۔

شاعر یعنی اختر حسین جعفری اپنے الفاظ کے ذریعے ایسی کیفیت پیدا کرنے اور اسے قاری کے ساتھ SHARE کرنے میں کامیاب ہے۔ یہی وہ لطیف ترین ابلاغ ہے جو "آئینہ خانہ" پر تبصرہ کرنے والوں کی گرفت سے باہر رہا۔ مثلاً جناب محمد سلیم الرحمٰن کے تبصرے سے "آئینہ خانہ" کے ناشرین نے یہ فقرہ کتاب کے فلیپ پر درج کیا ہے۔

It is a measure of uncompromising stance that he has attempted to house in his poetry the complexities of his personal experiences, the turbid flux of his emotions, in their amorphousness. His lyricism is vicious, with a crystallising glitter.

M. Saleem-ur-Rahman, The Pakistan Times,
Lahore, 19.4.1982.

یہیں جناب محمد علی صدیقی کے تبصرے سے ایک اور فقرہ نظر آتا ہے:

He seems to be traversing the areas of feeling lying beyond the frontiers of ordinary consciousness. How stealthily he builds up the effect -- in a decorous language and applies it to the kind of finish which is given to a mosaic painter.

Mohammed Ali Siddique, The Dawn, Karachi, 30.4. 1982.

یہ دونوں فقرے ہمارے موجودہ دور کے کسی بھی شاعر کے بارے میں کہے جا سکتے ہیں۔ ان الفاظ میں اختر حسین جعفری کے فن کی انفرادیت کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ دونوں فقرے محض ناقدانہ تعمیمات ہیں اور ہر تعمیم کی طرح سقیم ہیں۔ یہ الفاظ اتنے چکنے ہیں کہ قاری پر اپنا رعب تو چھوڑتے ہیں لیکن جب وہ اپنی مٹھی کھولتا ہے تو اس کے ہاتھ ویسے ہی خالی نظر آتے ہیں جیسے ایذرا پاؤنڈ کی وفات پر جعفری کو درختوں کے ہاتھ خالی نظر آئے تھے۔ یہاں مبصروں کی ناقدانہ کوتاہیوں پر تبصرہ مقصود نہیں اور نہ ہی ان کی شعر فہمی کو محل نظر ٹھہرایا جا رہا ہے بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ ابلاغ کی ایک ایسی لطیف صورت بھی ہوتی ہے جو محسوس تو کی جا سکتی ہے لیکن اتنے بڑے بڑے نقادوں کے، جو شاعر کے مافی الضمیر میں اتر جاتے ہیں، الفاظ کی گرفت میں بھی نہیں آتی۔

"آئینہ خانہ" کو پڑھتے وقت قاری کے ذہن میں دو نام ابھرتے ہیں۔ ایذرا پاؤنڈ اور ٹی۔ ایس ایلیٹ۔ پاؤنڈ کا ایک بڑا خوبصورت مرثیہ بھی کتاب میں ملتا ہے جو جعفری کا پاؤنڈ سے رشتہ جوڑنے میں قاری کی مدد کرتا ہے۔ اس کی شاعری کسی حد تک پاؤنڈ کے فارم کے متعلق نظریات سے لیکن بہت حد تک پاؤنڈ کے تنقیدی شعور سے متاثر ہے۔ اس کے باوجود جعفری کے لئے پاؤنڈ وجدان کا سرچشمہ نہیں ہے۔

تاہم دنیا میں ایلیٹ کا اثر زیادہ گہرا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی "ویسٹ لینڈ" کا اثر تقریباً تقریباً عالمگیر تھا۔ اس کی شاعری سے مختلف ممالک کے وہ شاعر متاثر ہوئے جو اپنے اپنے ملکوں سے باہر ہونے والے تجربات سے آگاہ تھے۔ ایلیٹ کا اثر یورپ میں خصوصاً اٹلی، سپین اور سویڈن تک محسوس کیا گیا۔ فلسطینی شاعر محمود درویش بھی کافی حد تک ایلیٹ کے تجربات سے متاثر نظر آتا ہے۔ چنانچہ نظم کے فارم کو ایلیٹ نے بہت متاثر کیا۔

فارم کی حد تک "آئینہ خانہ" کی ٹکنیک کا پیٹرن یوں ہے کہ ہر حصہ نو یا دس لائینوں پر مشتمل ہے۔ دو دو لائنیں متوازی چلتی ہیں جیسے:

اٹھائے کون حجاباتِ شاہد و مشہود
کہاں کسی پہ طلسمِ پسِ نگاہ کھلا
بتائے کون کہ کاغذ کی سطحِ خالی پر
بغیر حرف بھی نقطہ وجود رکھتا ہے

پہلی دونوں لائنیں باہم مربوط اور پھر تیسری اور چوتھی لائنیں متوازی اور مربوط ہیں لیکن پہلے دونوں مصرعے اور آخری دونوں مصرعے روایتی طریقے سے باہم منسلک نہیں ہیں۔ مگر ایک فضا تبدیل ہوتی ہے:

وہ قتل گاہ کہاں ہے جہاں پہ لفظوں نے
فراقِ حسنِ تمنا میں خودکشی کر لی

ہجوم راہ گزر منتظر ہے کس کے لئے
سحر ہوئی تو درِ نیم وا پہ قفل پڑا
چلی ہوا تو پہاڑوں نے راستہ نہ دیا
جواں ہوئیں تو گھروں سے نہ لڑکیاں نکلیں

یہاں جو لائین اسے اگلی فضا سے مربوط کرتی ہیں وہ "فراقِ حسنِ تمنا" والی لائین ہے اور اس کے بعد آنے والے تمام امیجز پہلی لائین کے (جو بنیادی لائین تھی) آخر تک پہنچتے پہنچتے کیژول (Casual) طریقے سے باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔ یہ بلا واسطہ مربوط نہیں ہوتے۔ یہ تجربہ "ویسٹ لینڈ" اور ایلیٹ کی دوسری نظموں میں موجود ہے۔ فرق یہ کہ وہ اگر پچاس مصرعے لکھتا ہے تو یہ اس کی اپنی ضرورت ہے۔ اس کا کینوس بڑا وسیع ہے جس میں قاری نظم کی فضا میں تو گھومتا پھرتا ہے لیکن پچاس مصرعے ہونے کی وجہ سے وہ اکثر بھول جاتا ہے کہ آغاز کہاں سے ہوا تھا۔ جعفری نے ایجاز سے کام لیا ہے اور "آئینہ خانہ" کی نظموں کو نو یا دس مصرعوں تک محدود کر دیا ہے لیکن اس طویل نظم کے بعد آنے والی نظموں میں جیسے "جہاں دریا اترتا ہے" یا "سخن درماندہ" میں تناظر وسیع تر ہو گیا ہے۔ اس وقت جعفری کا تجربات کرنے کا دور گزر چکا تھا۔ یہ نظمیں دس سال بعد کی نظمیں ہیں۔ یہ تکنیک کے تجربات ایلیٹ کے اثر کی وجہ سے ہی غمازی کرتے ہیں جیسے امریکہ کی بہت ساری شاعری کرتی ہے۔

معروف صحافی محمود شام کی ادارت میں

ہفت روزہ معیار کراچی سے ماہانہ ایڈیشن کا

سالنامہ — ۱۹۹۲ء

شائع ہو گیا ہے۔

جس میں ممتاز اور معروف اہلِ قلم
نمایش دہلوی، شور ریگ، احمد ندیم قاسمی،
عشرت رحمانی، میرزا ادیب، سید تنویر جعفری
راغب مراد آبادی، فاخرہ بخاری، ڈاکٹر زبیر رانا،
قتیل شفائی، جگن ناتھ آزاد، حبیب جالب،
ڈاکٹر انور سدید، محسن بھوپالی، ڈاکٹر سلیم اختر،
امجد اسلام امجد، منظر ایوبی، شہزاد احمد، نجم انصاری
ڈاکٹر وقار رضوی، جون ایلیا، جاذب قریشی،
ارشاد حسین کاظمی، احمد ہمیش، قیس رامپوری،
شام بارک پوری، ام اوطارق، تاج سعید، رشید امجد
احمد داؤد، شمشاد احمد، فہمدہ، ڈاکٹر علی خان، سلطان کھیل
نسیم، رئیس رامپوری، رحمان خاور، نقاش کاظمی،
عادل فریدی، اظہر عنایتی، عزیز ہزاروی، سعید پرویز،
منظر علی خان منظر، دلیپ سنگھ، نسیم آروی اور کئی
دوسرے اہم ادیبوں اور شاعروں کی تازہ ترین
تخلیقات اور
نمایش دہلوی، کمال احمد رضوی، اقبال مہدی،
ایس ایچ ہاشمی اور ممتاز بھٹو کے دلچسپ انٹرویوز
شامل ہیں۔

ضخامت ۲۲۴ صفحات

قیمت صرف ۳۰ روپے

بہرِ عید و جو باعثِ خلجان بن گئے
وہ لفظ کھردرے مری پہچان بن گئے

لفظ کہرام

تنویر سپرا

اردو اور پنجابی شاعری

میشل بک کونسل آف پاکستان
سے انعام یافتہ

گندھارا بکس

پوسٹ بکس نمبر ۶۶۵ راولپنڈی

دل سے کب اُس کی یاد جاتی ہے

محمد کاظم

"کیوں نہ ایسا ہو کہ ہم جس طرح آج مل بیٹھے ہیں، اسی طرح ہفتے میں ایک دن، یا شروع میں بے شک دو ہفتوں میں ایک دن، ایک جگہ جمع ہوں۔ ہم میں سے کوئی اپنی تازہ غزل سنائے، کوئی اپنی نظم پیش کرے، اور کسی نے اگر نثر میں کوئی چیز لکھی ہو تو وہ پڑھ کے سنائے۔ پھر اس پر ایک بے تکلفانہ سی گفتگو ہو، تبادلۂ آراء ہو، جو ادبی موضوعات کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے اور زندگی کے عام مسائل کے بارے میں بھی! اس چھوٹے سے حلقے کا کوئی نام نہیں ہونا چاہیئے اور نہ اس کے کوئی عہدے دار ہوں۔ بس کچھ ہم مزاج لوگوں کے مل بیٹھنے اور ایک دوسرے کے خیالات و احساسات سے آگاہ ہونے کا ایک موقع بہم پہنچنا چاہیئے۔ جو آج کل کی زندگی میں کم کم ہی نصیب ہوتا ہے ....."

کچھ ایسی ہی تجویز تھی۔ الفاظ شاید یہ نہ ہوں، لیکن مدعا کم و بیش یہی تھا، جس پر سب نے بڑے شوق اور امنگ کے ساتھ اتفاق کیا۔ ہم کل چھ افراد تھے جو ایک جنازے سے واپسی پر اختر حسین جعفری کے گھر میں جو راستے میں پڑتا تھا، ٹھہر گئے تھے۔ جب ہم گھر کے باہر اس کے گھر پہنچے تو جعفری نے جو ہمارے ساتھ ہی آیا تھا، اپنی عادت کے مطابق ٹھنڈے مشروبات اور مٹھائی اور دوسرے ماکولات کے ساتھ ہماری تواضع کی۔ کھا پی کر جب ہم ذرا آسودہ ہوئے اور آنکھوں میں چمک آئی تو ہم نے اختر حسین جعفری سے اس کی تازہ تخلیق "نومبر کے پہلے ہفتے پر ایک نظم" سننے کی فرمائش کی۔ جعفری نے پہلے تو اچنبھے سے ہمیں اس طرح دیکھا گویا جاننا چاہتا ہو کہ واقعی ہم سنجیدہ ہیں۔ جب ہم نے اپنی فرمائش پر اصرار کیا تو وہ اپنی پاٹ دار آواز اور اپنے مخصوص درد بھرے لہجے میں، ٹھہر ٹھہر کر، ہمیں وہ نظم سنانے لگا:

..... دھواں دھواں شام کے الاؤ میں کوئی جنگل جلے
کہ روکھی ہوئی تمنا
خزاں کا پانی کوئی اشارہ نہیں سمجھتا
یہ نہر اب تک پرانے پہرے میں چل رہی ہے .....

کچھ اس نظم نے اور کچھ جعفری کے پڑھنے کے انداز نے ایسا سماں باندھا کہ ہم سب اس کے سحر تلے آ گئے۔ رشید ملک ایک عالمِ وارفتگی میں اپنے پائپ کے کش پر کش لینے لگے۔ خالد احمد جو بیچ کی تپائی کے ساتھ لگا نیچے بیٹھا تھا کچھ دیر کے لئے کھانا پینا بھول گیا۔ اور نجیب احمد جو دوسری طرف صوفے پر دراز تھا بالکل بت بنا یہ کلام سن رہا تھا۔ نظم جب ختم ہوئی تو ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ اگر اختر حسین جعفری کا کلام ٹھیک سے سمجھنا اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونا ہو تو اسے خود شاعر کی زبان سے سننا چاہیئے۔ شاعر کی زبان سے سننے کے بعد کم از کم مجھ پر اس نظم کی کچھ ایسی اَبعاد (Dinensio: s) آشکار ہوئیں جن کی طرف یہ نظم پڑھتے ہوئے پہلے

میرا خیال نہیں گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک ہم نے اس نظم اور اس کے پس منظر کے بارے میں ایک سادہ اور بے ساختہ سی گفتگو کی جو میں سمجھتا ہوں اپنے اندر افادیت کے بہت پہلو رکھتی تھی۔ بات سے بات چلی، اور ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اس طرح کی نشست ہم وقفے وقفے سے باقاعدگی کے ساتھ منعقد کیا کریں، اور دوسرے ہی لمحے اس خیال نے اس تجویز کی صورت اختیار کی جس کا ذکر اوپر شروع میں آتا۔

افسوس کہ اس تجویز کو عمل جامہ پہنانے کے لئے کوئی تفصیلات طے نہ کی جا سکیں اور نہ پہلی نشست کے لئے جگہ اور تاریخ کا تعین کیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس دن اتفاق سے جمع ہونے والے اس گروہ کے افراد اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے اور اس واقعے پر دو ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ اختر حسین جعفری ہم سب کو چھوڑ کر آگے چل دیا!

جعفری کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ اپنی نظموں میں تو وہ اپنے دل کی بات کہتا ہی رہتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ شاعری کا ایک بہت قابل نقاد بھی تھا اور اس کی نظر نہ صرف اردو شاعری پر بلکہ انگریزی اور مغربی شاعری پر بھی بہت وسیع اور گہری تھی۔ ایذرا پاؤنڈ، ایلیٹ، پابلو نرودا اور رلکے جیسے شاعروں کو اس نے پڑھ رکھا تھا اور ان کے تنقیدی نظریات اور تخلیقی رویوں سے وہ اچھی طرح واقف بھی تھا اور خاصی حد تک ان سے متاثر بھی! اس دن کی تجویز کے مطابق اگر ہمارا یہ چھوٹا سا ادبی کلب قائم ہو جاتا تو میرا خیال ہے اختر حسین جعفری کو ہم لوگوں سے کچھ حاصل ہوتا یا نہ، ہم اس سے جدید شاعری کی مقامی اور عالمی روایت کے بارے میں بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔

جعفری کے ساتھ میری طویل ملاقاتیں بس گنتی کی ہی رہی ہوں گی، اگرچہ ایک زمانے میں "فنون" کے دفتر میں ہم ہفتے میں ایک یا دو بار ضرور اکٹھا ہوتے تھے۔ ان چند طویل ملاقاتوں میں جعفری کی گفتگو کا موضوع آج کی اردو نظم، اس کے اہم نمائندے اور اس شاعری پر اثر انداز ہونے والی مغربی شعری روایت ہوتی تھی۔ اس موضوع پر اس کی معلومات کا ذخیرہ حیران کن تھا۔ اس نے مغرب کی اچھی شاعری ہی نہ پڑھی تھی، اس شاعری کے ممتاز نقادوں کو بھی پڑھا تھا۔ اس کی باتیں سننے کے بعد مجھے یوں لگتا جیسے شاعری کی سی اہم ادبی صنف کو میں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا اور نہ اس کے بارے میں کبھی سوچنے اور پڑھنے کی ضرورت محسوس کی ہے، جو ادب کے ایک سنجیدہ قاری کے لئے شرم کی بات ہے۔ چنانچہ میں اس کے ہاں سے ہمیشہ یہ عزم لئے ہوئے اٹھتا کہ اب میں اپنی اس کوتاہی کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں اب سوچتا ہوں کہ ان ملاقاتوں میں اختر حسین جعفری جو کچھ کہتا تھا، اگر گھر آ کر میں اس کے کچھ نوٹس لے لیا کرتا تو فن شعر کے بارے میں جعفری کی آراء اور نظریات کا ایک اچھا ذخیرہ میرے پاس جمع ہو جاتا۔

ابھی کوئی دو سال ادھر میری اس سے اسی طرح کی ایک لمبی ملاقات ہوئی۔ "بزم مجلس ترقی ادب" کے دفتر سے اٹھے اور لاہور کے ہوائی اڈے پر گئے جہاں ان دنوں وہ کسٹمز کے محکمے میں کوئی اونچا افسر لگا ہوا تھا۔ پتہ نہیں اسے وہاں اس دن کیا کام تھا ہم مسافروں کی آمد والے لاؤنج میں داخل ہوئے اور ایک طرف کمرے میں جا بیٹھے۔ لاؤنج میں متعین عملہ سراپا احترام بنا بڑی چستی اور مستعدی کے ساتھ ہماری خاطر مدارات میں لگا ہوا تھا۔ اس دن ہم نے چائے پر بڑے امن و سکون کے ساتھ ادب و شعر کی باتیں کیں۔ یہ ساری باتیں تو مجھے اب یاد نہیں رہیں، ہاں ان کا ایک تھوڑا حصہ میں اپنے حافظہ کی مدد سے بیان کر سکتا ہوں۔ اس میں کوشش کروں گا کہ جعفری کی زبانی جو بھی بات ہو، وہ جہاں تک ہو سکے اس کی اپنی ڈکشن میں بیان ہو۔

آج کی نظم کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ جعفری کہنے لگا: آپ نے بھی یہ محسوس کیا ہو گا کہ آج کی غزل کے مقابلے میں ہماری آج کی نظم زیادہ جدید اور نئے لہجے کی حامل لگتی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ جدید نظم میں ہمارا سارا محاورہ Borrowed ہے، جبکہ ہماری غزل جدید ہوتے ہوئے بھی کئی سطحوں پر کلاسیکی روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھتی ہے۔

نظم کے اچھے شعراء کا ذکر چلا تو جعفری نے کہا، کوئی شک نہیں کہ ظہور نظر نظم کا Committed شاعر تھا لیکن میں مجید امجد کو اس سے زیادہ نظم کے ساتھ Committed سمجھتا ہوں۔ ظہور نظر اس لئے زیادہ Prominent نہ ہو سکا کہ نظم میں اس کے معاصر میراجی، ن۔م راشد اور پھر فیض، ندیم اور مجید امجد جیسے لوگ تھے۔ معاصر اگر قد آور ہوں تو انسان کی پہچان پوری طرح نہیں ہو پاتی اور وہ ان کے سامنے دب جاتا ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ ظہور نظر کا مسئلہ پی آر (تعلقات عامہ قائم کرنے) کا نہیں تھا جس کی طرف آپ نے اپنی ایک تحریر میں اشارہ کیا ہے، بلکہ اس کا مسئلہ معاصرت کا تھا۔ گفتگو جاری رکھتے ہوئے جعفری نے کہا، احمد ندیم اور آفتاب اقبال شمیم اپنی بگ دو نظم کے بہت اچھے شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں مجھے اس کوشش کی کمی محسوس ہوتی ہے جو نظم کے اجنبی اور Borrowed محاورے کو اپنی ثقافت اور روایت کے سانچوں میں ڈھالنے کے لئے کی جانی چاہیئے۔ شاعر جب اجنبی نمونوں کو لے کر انہیں اپنے ماحول اور محاورے میں ڈھالتا ہے تو وہ نظم جدید ہوتے ہوئے بھی اپنے ہاں کی نظم لگتی ہے، اپنی روایت سے رشتہ جوڑے ہوئے! لیکن یہ عمل نہ ہو سکے تو نظم اکہری اکہری رہتی ہے۔ افتخار جالب وغیرہ کے تجربے اسی وجہ سے ناکام ہو گئے تھے۔

باتوں کا سلسلہ جب آگے بڑھا تو میں نے جعفری کی اپنی شاعری کے بارے میں قدرے محتاط انداز میں اپنا خیال پیش کیا کہ اس کی نظم پڑھتے ہوئے ایک سے زیادہ پیکر (Images) سامنے آتے ہیں، اور کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ نظم کو بار بار پڑھنے اور اس پر غور کرنے سے ان Images کا باہمی ربط مل جاتا ہے، لیکن کبھی اس ساری کوشش کے باوجود یہ ربط نہیں ملتا، اور یوں لگتا ہے کہ بیچ میں کچھ مصرعے تھے جو حذف ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں قاری نظم کے مصرعوں کی خوبصورت بُنت اور ان کے شاندار آہنگ ہی میں کھو جاتا ہے اور اپنی یہ کوشش ترک کر دیتا ہے، اس پر جعفری کچھ Formal سا ہو گیا کہنے لگا: میں آپ کے اس خیال سے ایک حد تک ضرور اتفاق کروں گا۔ لیکن میں اس میں آپ کے ساتھ پوری طرح متفق نہیں ہو سکتا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میری نظم کا ہر ایک مصرع الگ الگ ایک خاص صورت حال کے لئے امیج فراہم کرتا ہے اور یہ سب Images مل کر وہ فضا اور وہ Sensibility سامنے لاتے ہیں جو شاعر قاری کے ساتھ Share کرنا چاہتا ہے۔ یہ کہنا کہ پوری نظم پڑھنے سے کوئی مربوط اور وحدانی تاثر قائم نہیں ہوتا، جدید نظم کے تقاضوں سے بے خبری کی دلیل ہے۔ تو گویا جعفری کی مراد یہ تھی کہ جدید نظم کے اندر Multiple Images ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں، اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان امیجز کے موزیک کا ایک ہی طرح کا آسان فہم اور سیدھا سادا پیٹرن سامنے آئے۔ یہ پیٹرن Complex ہو سکتا ہے اور اپنی نوع میں تجریدی بھی!

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے جعفری نے کہا: آج کل ضیا جالندھری کا رسالہ 'علامت' نکلنے لگا ہے۔ اس میں ضیا نے بھی میری شاعری کے بارے میں کچھ اسی طرح کے ریمارکس دیئے۔ لیکن پھر اس کے ساتھ کئی کئی دن میری طویل گفتگو ہوتی رہی اور اس کی یہ غلط فہمی بالآخر دور ہو گئی، اگرچہ اس کے لئے مجھے اس کے کئی کھانے کھانے پڑے!

اختر حسین جعفری اپنی شاعری کے بارے میں بے حد حساس تھا۔ ہمارے ہاں کے ایک معروف ادیب نے جب اس کے بارے میں یہ لکھا کہ جعفری کی نظم خوبصورت تو بہت ہوتی ہے لیکن وہ عموماً معانی اور مفاہیم کی کوئی جہت متعین نہیں کرتی، تو جعفری پر اس کا

اثر ہوا اور وہ میرے ساتھ اس کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس موقع پر میں نے اس کے ساتھ جو بات کی وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے کہا "اختر حسین جعفری! آپ کو اپنے مقام کی پہچان ہے یا نہیں؟" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں ہے کیوں نہیں ہے"۔ میں نے کہا "تو پھر آپ کو اس کی پروا نہیں ہونی چاہیئے کہ کوئی آپ کے بارے میں کیا کہتا ہے ——— اور ہاں اگر ضرورت پڑی تو آپ کی طرف سے جواب دینے کے لئے ہم میدان میں آئیں گے"۔ اس سے وہ وقتی طور پر خوش اور مطمئن ہو گیا۔ لیکن میرے خیال میں اس کے دل کی خلش دور نہ ہوئی، جب تک کہ اس کی مداح ایک خاتون نے اس کے فن کے بارے میں معاملے کی اس طرح سے وضاحت نہ کر دی کہ ہم سے شاید کوئی بھی اس طرح نہ کر سکتا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اب سے بہت پہلے اس زمانے میں پیش آیا جب "فنون" کا دفتر انارکلی میں ایک عمارت کی دوسری منزل پر ہوتا تھا۔ اس میں ہم ایک دن حسب معمول جمع تھے اور ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ جناب علی عباس جلالپوری کو خدا جانے کیا سوجھی، انھوں نے اختر حسین جعفری کو مخاطب کر کے اُس کی معاصر نسل کی اردو شاعری کے بارے میں سوال کیا کہ بتائیے تو سہی اس ساری شاعری کی اہمیت اور قدر و قیمت کیا ہے؟ اُن کے نزدیک گویا یہ محض تقفیہ پیمائی کا ایک شغل بے کار تھا۔ یہ سن کر جعفری سکتے میں آ گیا، اور سید صاحب کا لحاظ کرتے ہوئے وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ لیکن دوسرے ہی دن وہ مجھے "فنون" کے دفتر جانے والی سیڑھیوں میں مل گیا۔ اوپر پہنچ کر وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا "سر! میں نے کل رات ایک غزل لکھی ہے، جو میں چاہتا ہوں آپ اندر جانے سے پہلے سُن لیں"۔ اس نے غزل سنائی:

نہ خشت باتھ میں میرے، نہ تیرے بات میں تھی
شکستگی کی نمو آئینے کی ذات میں تھی
تعلقات تھے یا سرد پانیوں کا سفر
چلا تو برف سی قندیل میرے ہات میں تھی
میں بادِ بحر سرِ دشت آرزوئے سحر
وہ شاخسار سی روشن اداس رات میں تھی .....

غزل سُن کر میں نے کہا "آپ کی اس غزل کا تعلق کل کے واقعے سے تو نہیں ہے"؟ جواب میں جعفری کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کہنے لگا: "کاظم صاحب میں آپ سے سچ کہتا ہوں، کل کے اس واقعے سے میں رات سو نہیں سکا، اور جب تک یہ غزل نہیں ہو گئی میری آنکھ نہیں لگی"۔

ظہور نظر کے معاملے میں تو جعفری نے پی۔ آر کی اہمیت سے انکار کیا تھا، لیکن خود اس نے اپنی پی۔ آر سے غفلت برت کر اس کا یہ نقصان اٹھایا کہ نہ اس کے مرتبے کے مطابق اس کے نام کی شہرت ہوئی، اور نہ اس کے کام کے بارے میں نقادوں اور مبصروں نے کوئی زیادہ گفتگو کی۔ مختلف ادبی اصناف کے انتخاب کا ایک سلسلہ "پاکستانی ادب" کے عنوان سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی پانچویں جلد (تنقید) میں دو فاضل نقادوں نے جدید اردو نظم پر مضامین لکھے تو ان میں سے کسی نے بھی اختر حسین جعفری کو ذکر کے قابل نہ سمجھا۔ اسی طرح کچھ عرصہ ہوا "سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ" کے عنوان سے ہندوستان کے نامور نقاد گوپی چند نارنگ کی ایک کتاب آئی، اس پر میں نے ایک سرسری نظر ڈالی تو اس میں مجھے اختر حسین جعفری کا نام کہیں دکھائی نہ دیا۔ یہ ایسے تھا جیسے کوئی اردو شاعری میں مردِ مومن کا استعارہ ڈھونڈنے نکلے اور اقبال کو نظر انداز کر جائے۔

شاید ایسی ہی صورت حال کو دیکھ کر اختر حسین جعفری نے اپنی شخصیت کے اظہار کا ایک دوسرا راستہ نکالا۔ اس نے "فردا" کے نام سے ایک کتابی سلسلے کی اشاعت کا آغاز کیا جو بہت ہی معیاری اور منتخب تخلیقات اور مضامین کا ایک بیش قیمت مجموعہ تھا۔ اس سلسلے کا پہلا نمبر جب تیاری کی منزل میں تھا تو جعفری نے مجھ سے جدید عربی شاعر ایڈونس کے ترجموں یا اس کی شاعری کے بارے میں ایک تنقید مقالے کی فرمائش کی۔ پتہ نہیں ایڈونس کا نام اس نے کہاں سے سُن لیا تھا اور کہاں اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ میں نے اپنے پاس موجود عربی رسالوں میں اس شاعر کی چیزیں تلاش کیں، لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملیں۔ اور "فردا" کا پہلا شمارہ شائع ہو گیا۔ اب وہ اس سلسلے کے دوسرے نمبر کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ ایک دن ملا تو کہنے لگا۔ "سر! فردا کے پہلے شمارے سے تو آپ غائب رہے، لیکن اس دفعہ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ اس دفعہ آپ اس کے لئے ضرور کوئی چیز لکھیں گے۔ میں آپ کے لئے کوئی موضوع متعین نہیں کروں گا۔"

انسان کے انہی منصوبوں، آرزوؤں اور امنگوں کا نام زندگی ہے۔ اگر ہمارا وہ منصوبہ بھی عمل میں آ گیا ہوتا جس کے مطابق ہم لوگوں کو ہفتے میں ایک روز ایک جگہ جمع ہونا تھا تو اختر حسین جعفری کے ساتھ مل بیٹھنے کے کیسے کیسے موقع بہم پہنچتے لیکن اب؟ ایک شاعر کہتا ہے:

ملیں گے اب بھی، مگر آہ! کب؟ کہاں؟ کیوں کر؟

"ناتمام" اور "ناگزیر" کے بعد

محسن احسان کا تیسرا مجموعۂ کلام

ناشنیدہ

الحمد پبلی کیشنز
لیک روڈ سے طلب فرمائیے

تصویریں سانس لیتی ہیں
(افسانے)
غافر شہزاد
قیمت/۴۵ روپے

چراغ آنکھوں میں
(شاعری)
غافر شہزاد
قیمت/۵۰ روپے

ناشر
پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز لوئر مال لاہور

خالد احمد

اختر حسین جعفری کیلئے

بہت میٹھی مہک تھی اُس کی مٹی میں
وہ اپنی سطر کا گارا ذرا نمکین پانی سے اُٹھاتا تھا
وہ خوشبو اور لفظوں سے بُن و بیخِ اثر تعمیر کرتا تھا
وہ معمارِ محبت تھا، محبت کے نگر تعمیر کرتا تھا
وہ دُکھ کی سمت دَر، سورج کے رُخ روزن بناتا تھا
وہ جتنے گھر بناتا تھا، بہت روشن بناتا تھا
خلیلِ بیتِ فن —— اسلاف کا مسند نشیں —— ٹھہرا
یہ خلعت صرف اُس سروِ رواں کے قامتِ فن پر
سرِ قدِ سخن سے تا قدم —— پوری اُترتی تھی
وہ معمارِ محبت تھا، محبت کے نگر تعمیر کرتا تھا
کوئی دیوار ڈھہہ جاتی، کوئی رخنہ نکل آتا
وہ اہلِ غم کا پروردہ سرِ صحرا نکل آتا
وہ ہر شب، از سرِ نو، بیتِ غم تعمیر کر لیتا
خلیلِ بیتِ فن —— شہرِ ادم تعمیر کر لیتا
بہت میٹھی مہک تھی اس کی مٹی میں، وہ اپنی سطر کا گارا
ذرا نمکین پانی سے اُٹھاتا تھا

تری بے چین آنکھیں مجھ کو بھی بے چین رکھتی تھیں

تری آنکھوں میں نیندیں تھیں، کہ تیرا رزق محنت تھا، سو راتوں کو کماتا تھا
تری نیندوں میں سپنے تھے کہ تیری نیند اک بے رغبتی کے ساتھ آتی تھی
ترے سپنوں میں سطریں تھیں کہ تیرے خواب بن کانٹوں کی بیری تھے
تری سطروں میں جذبے تھے، کہ تیرا جذبِ صادق وہ پیالہ پی کے خالی
کر چکا ہے جُرعہ جُرعہ جس میں ہم حصّے کے طالب تھے
تجھے جذبوں پہ قابو تھا، مگر یہ ایک ایسا ظلم تھا جو تُو نے اپنی جان سے بڑھ کر
ہمارے تن پہ توڑا تھا
تجھے اشکوں پہ قابو تھا، ترے آنسو فقط سینے میں گرتے تھے، مگر سطروں میں پھرتے تھے
وہ اپنی سطر کا گارا ذرا نمکین پانی سے اُٹھاتا تھا
خلیلِ فن، خدا کا دوست تھا، ہم سے مساکیں دوست رکھتا تھا
مساکیں نے، تجھے شب بھر، ترے پانی میں نہلایا
تری یادوں میں کفنایا، تری مٹی میں دفنایا
جنازہ اُٹھ چکا ہے، بَین سُن سُن کر، یہ دل غمگین ہونا چھوڑ بیٹھا ہے

سخن آسان آنکھوں کے کٹوروں میں
ہنر آباد لفظوں کی تہوں میں، اَن گنت شب تاب موتی جھلملاتے ہیں
کہیں بہتا ہوا پانی
کہیں شفّاف پانی کی تہوں میں اَن گنت شب تاب موتی ہیں
کہیں لمبے، گھنے سائے
اک آدھی اینٹ کا تکیہ
اس آدھی اینٹ کے پیچھے، وہ بن کانٹے کی بیری ہے
کہ جس بیری تلے تختِ سخن آراستہ ہے
تا ابد جس پر ہمارا گلشنِ بے خار، دل آرام، گُل اندام بیٹھے گا

خالد احمد

اختر حسین جعفری کا نوحہ

(ندیم کے آنسوؤں کے لئے)

اے سینہ زنو، دیکھو، زنجیر ہے اور مَیں ہوں
لاہور کی گلیاں ہیں، تقدیر ہے اور مَیں ہوں

پیوستِ گلو کیا ہے؟ دل ہے کہ لہو کیا ہے؟
اک درد ہے اور دل ہے، اک تیر ہے اور مَیں ہوں

دل ٹوٹ کے کب ٹوٹا، سر پھوٹ کے کب پھوٹا
دیوار ہے، اُس بت کی تصویر ہے اور مَیں ہوں

پَل پَل اسے بڑھنا ہے، پگ پگ اسے پڑھنا ہے
ہر سمت، ترے غم کی تحریر ہے اور مَیں ہوں

اِک بُت کی طرح سِل میں، رہتا ہے مرے دل میں
اے خاکِ لحد، تیرا نخچیر ہے اور مَیں ہوں

شب بھر یونہی روتے ہیں، دن دیکھ کے سوتے ہیں
خالد، صفِ یارانِ دل گیر ہے اور مَیں ہوں

غم رفتہ و دم بستہ یا آپ ہیں یا مَیں ہوں
ہر سانس، الم بستہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

حد آپ لکیری ہے، یہ کیسی اسیری ہے؟
اس دشت میں رَم بستہ یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

زنجیر دھنک سی ہے، خوشبو سی چھنکتی ہے
ہر گام، قدم بستہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

کس وصل کی وحشت میں، کس ہجر کی دہشت میں
دم رفتہ و دم بستہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

لب کھول کے رہ جانا، پر تول کے رہ جانا
پَر بستہ، قلم بستہ، یا آپ ہیں یا میں ہوں

اک درد میں بستے ہیں، رونے کو ترستے ہیں
ہر سانس الم بستہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

آوارہ و سرگشتہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں
اس شہر میں برگشتہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

اے رایتِ آزادی، اے غایتِ آزادی!
پَر کھول کے پَرگشتہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

ہر نقطہ اک آنسو تھا، مصرع تھا سو جادُو تھا
غم بستہ، ہُنر گشتہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

حق بھول کے گاؤں کے، بیٹے چلے ماؤں کے
گم راہ و سفر گشتہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

آباد ہیں ویرانے، دل شاد ہیں دیوانے
اک دستکِ درگشتہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

اک شہرِ نوا بستہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں
اک خاک میں پابستہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

غم آنکھ میں بستے ہیں، پلکوں سے برستے ہیں
اک تارِ عنا بستہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

اُترے تھے سرائے میں، اک پیڑ کے سائے میں
اس پیڑ سے وابستہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

نخچیرِ شناسائی، محتاجِ پذیرائی!
بستی میں، خدا بستہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

یہ کس کی خدائی ہے، ہر سمت جُدائی ہے
ہر سانس رضا بستہ، یا آپ ہیں یا مَیں ہوں

اک خاک میں پابستہ، یا آپ تھے، یا مَیں تھا
اس خاک میں پابستہ، یا آپ ہیں، یا مَیں ہوں

فصلِ گُلِ یکتائی، تب آپ تھے، اب ہم ہیں
اس خاک کی رعنائی، تب آپ تھے، اب ہم ہیں

جھلمل ہیں دل و جاں بھی، آفاق بیاباں بھی
نورِ مہِ تنہائی، تب آپ تھے، اب ہم ہیں

ہر سمت کو چھُو آئے، ہر سمت سے لَو آئے
آوازۂ صحرائی، تب آپ تھے، اب ہم ہیں

ہر بات پہ کھِل اُٹھنا، محفل سے خجل اُٹھنا
اک لالۂ رسوائی، تب آپ تھے اب ہم ہیں

رنگوں کے اُچھالے ہیں، نظمیں ہیں کہ جھالے ہیں
ہر سطر کی برنائی، تب آپ تھے اب ہم ہیں

مامورِ شکیبائی، اس شہر میں سودائی
اس حبس میں پروائی، تب آپ تھے اب ہم ہیں

خالد احمد

غمِ لازوال

ترا ہم خیال ہونا ، ترا ہم ملال ہونا
ترے فن میں غم نے سیکھا غمِ لازوال ہونا

ہمیں یوں نہ راس آیا کہ فلک نہ دیکھ پایا
ترا ہم نشین ہونا ، ترا ہم جمال ہونا

نکل آئے تیری دھج سے ترے آنسوؤں میں سج کے
ہمیں راس آ نہ جائے ، ترا ہم کمال ہونا

ترے بعد کہہ رہے ہیں کہ یہ کرب سہہ رہے ہیں
شبِ ہجر کس سے سیکھے سحرِ وصال ہونا

کفِ پا نہ دھر سکیں گے ترے نقشِ پا تکیں گے
ہنر آزما رہے گا ، ترا بے مثال ہونا

ترے سطر جاتے جاتے ، ترے غم تک آتے آتے
لبِ انجمیں نے سیکھا ، نمکیں مقال ہونا

تجھے دیکھ کر پڑھیں گے ، تجھے پڑھ کے پھر پڑھیں گے
کہ ترے سخن کو آیا ، سخنِ شمال ہونا

ترا ہم زبان کر دے ، ترا ہم نشان کر دے
درِ پنجتن پہ اپنا ہمہ تن سوال ہونا

ترے حرف میں ضیا ہے ، ترا فن جہت نما ہے
رخِ یار جلوہ آرا پسِ ماہ و سال ہونا

خالد احمد

اختر حسین جعفری کیلئے

کھلا عمامۂ کہساء ، برف بال اُڑے
زمیں پہ آن رہا نخلِ گریہ و ماتم
بھگو رہا ہے بدن نوحہ آبشاروں کا

ہوائے تُند کے سینے سے لگ کے گریاں ہیں
کہیں گلاب، کہیں یاسمن، کہیں سوسن
ہیں کس مہک کے عزادار، شاہدانِ چمن

کہیں وہ چھب نظر آئے، وہ ڈھب دکھائی پڑے
اُٹھ اُٹھ کے دیکھتے ہیں، رمز کیا؟ اشارہ کیا؟
پلٹ سکا نہ بیاباں نوردِ بُود و نبود

حیات، گنجِ خمِ کاکلِ مسلسل ہے
نہالِ غم پہ فقط آبلے مہکتے ہیں
سپیدۂ تنِ مہجور ہو گیا کافور

کنایہ کار گیا، استعارہ کار گیا
نئے مزاج کی سطریں، انوکھے ڈول کے بند
نئے طیور، نئے ساحلوں پہ اُترے تھے

پسِ سخن، سخن آرا ہے خاکِ سجّادہ
ترا سخن، تب و تابِ حیات رکھتا ہے
کہ تیرا فن، نمِ آبِ حیات رکھتا ہے

یہ نیشِ مرگ سم آغشتۂ حیات رہا
ستارہ وار، دھڑکتے دلوں پہ اُتریں گے
ترے طیور، نئے ساحلوں پہ اُتریں گے

ایوب خاور

اختر حسین جعفری کے لئے ایک نظم

درِ دنیا پہ سبھی یار کھڑے ہیں گُم سُم
اور یہ سوچتے ہیں
اس طرح بھی کوئی ناراض ہوا کرتا ہے؟

آنکھ میں نم، نہ خطِ رُخ پہ خطِ حزن و ملال
ہاتھ میں نظم کے اسرار میں ڈوبا ہوا کاغذ ہے
نہ ماتھے پہ کسی سطرِ دلآویز کی لَو
لبِ ساکت پہ کوئی حرفِ وصیّت، نہ دعا اور نہ سلام
اس طرح بھی کوئی ناراض ہوا کرتا ہے؟

جُوتے پہنے ہیں، نہ کُرتے کے بٹن بند کئے
بس اچانک ہی اُٹھے
جیسے آنگن سے کسی زرد بگولے کا گماں اُٹھتا ہے
یوں چلے
جیسے کسی صحنِ گلستاں کی ہَوا
جانبِ دشتِ وفا چلتی ہے

یوں اُڑے
جیسے کسی بیوہ کے شانوں سے ردا اُڑتی ہے
اس طرح بھی کوئی ناراض ہوا کرتا ہے؟

آئینے، آئینہ خانوں میں چٹخنے کے لئے
کون یوں چھوڑتا ہے
اَن کہی نظم کی سطروں میں پگھلنے کے لئے
کون اک خواب کی زنجیر کو یوں توڑتا ہے؟
اس طرح بھی کوئی ناراض ہوا کرتا ہے؟

اس طرح بھی کوئی حیرت سے کھُلی آنکھوں میں
اپنے ہی ہجرِ مسلسل کا لہو بھرتا ہے؟
اس طرح سے بھی کوئی صاحبِ اُسلوب کبھی مرتا ہے؟

ایوب خاور

جعفری صاحب کے لئے

درد کی سِل ہے کہ دل ہے
جو دھڑکتا نہ پگھلتا ہے مرے سینے میں
یہ پگھل جائے تو اس میں سے ٹپکنے والے
سیلِ غم زاد سے کچھ حرف چُنوں
نظم لکھوں

مگر اے ہجر نژادوں کو پرکھنے والے!
نظم لکھنے میں نہیں آتی ہے!
تعزیت دھول بھری آنکھوں کے چورستے میں
درد کے نور میں لپٹی ہوئی چُپ بیٹھی ہے!
نظم لکھنے میں نہیں آتی ہے!
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے اظہار کا چاند
رات چلتی ہے نہ اظہار کی رو چلتی ہے
اک عجب سکر کا عالم ہے
رگِ جاں پہ مسلط ہے لحد کی ٹھنڈک
استخواں بولتے ہیں
اور نہ سفالِ رُخ دلدار پہ خوشبو کے سخن
کھُلتے ہیں
سبز بادل کے بھرے چھاج برستے ہیں
نہ شاخِ ہُنرِ شعر پہ نم اُگتا ہے
اے مرے ہجر نژادوں کو پرکھنے والے!
تُو نے مٹی میں اُتر کر کل شام
کس قفس میں ہمیں زنجیر کیا
نظم بنتی ہی نہیں
درد کی سِل ہے کہ آہوں سے پگھلتی ہی نہیں!

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

اختر حسین جعفری کا "آئینہ خانہ"

فتح محمد ملک

اختر حسین جعفری بھی عجب شاعر ہے۔ جتنا جدید ہے اُس سے بڑھ کر قدیم ہے۔ جتنا قدیم ہے اُس سے کہیں زیادہ جدید ہے۔ عجب شاعر ہے کہ ابن العربی کے تصورِ کائنات اور فلسفۂ عشق سے جس انہماک کے ساتھ فیض پاتا ہے اُسی اہتمام کے ساتھ جدید شاعر کے لئے ایذرا پاؤنڈ کے بتائے ہوئے اوامر و نواہی کی پابندی کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ:

> "شاعری ایک مسلسل ریاضی کا عمل ہے۔ جس طرح خوبصورتی کی کوئی آخری تعریف نہیں۔ اسی طرح خوبصورت مصرعے کی بھی کوئی آخری تعریف نہیں۔ چنانچہ شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جس فارم میں اظہار کرتا ہے اُس کے تمام امکانات دریافت کرنے کی سعی کرے۔"[1]

چنانچہ حُسن اور حُسنِ کلام کا یہ شاعر "بادلوں کے نام زمین کا اوّلین مکتوب" لکھتے وقت اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ:

> "مظاہر و مخفیات کی گفتگو سُننے کا کمی، بصری اور حسّی طریقہ، شنید کے اس تجربے کی درونِ ذات تحلیل کا فن، اس تجربے کی شعری تمثیلات اور پیکر سازی کے حوالے سے ترسیل میں نو بہ نو پیرہن تلاش کرنے کی تخلیقی خو کے اشارے مجھے غالب، ایذرا پاؤنڈ، ٹی ایس ایلیٹ جیسے مستند ہنرمندوں اور پیلو نرودا، رابرتو سینسی جیسے باصلاحیت ہم فکر اور ہم عصر رفقائے کار کی علمی مصاحبت میں ملے۔"

اختر حسین جعفری کے شعری مزاج اور فکری افتاد کو سمجھنے میں "آئینہ خانہ" کا ابتدائیہ ہی نہیں بلکہ ایذرا پاؤنڈ، احمد ندیم قاسمی اور مجید امجد پر اُس کی نظمیں اور ابن العربی سے ماخوذ یہ نظم ہماری رہنمائی کو کافی ہیں:

ہوائے بھید سبھی موسموں کے کھول دیئے
نقاب اُلٹا تو سب بادشہ فقیر لگے
شہود، غیب، زمیں، آسماں، وجود، عدم
مسافرانِ سحر رات کے سفیر لگے

کفِ گلاب پہ بکھرا تھا رنگ و بو کا لہو
درونِ سنگ دلِ آئینہ دھڑکتا تھا

○ یہ مضمون مارچ ۱۹۸۳ء کی تحریر ہے۔

[1] "اختر حسین جعفری سے ایک ملاقات"، عطاالحق قاسمی، نوائے وقت، لاہور۔

بدن یقین کا معتوب مجرموں کی طرح
درِ گمان کی زنجیر سے لٹکتا تھا

ہوا نے ارض و سما پر کمند جب پھینکی
حقیقتوں کی گرہ گردنوں پہ تنگ ہوئی
نجوم تیرہ تو شاخِ زغال تھی روشن
زمین دیکھ کے اپنا جمال دنگ ہوئی

ہوا نے بھید سبھی موسموں کے کھول دیئے
شہادتوں کا ہر اک حرف منحرف نکلا
رُخِ بشر سے جو پردہ اُٹھا تو بُھوبے میں
وہی تھا چہرہ جو صبحِ ازل کو دیکھا تھا

(ہوا نے کھول دیئے بھید)

ابن العربی سے ماخوذ یہ خوبصورت نظم صرف "شہود، غیب، زمین، آسمان، وجود، عدم" ہی کے بھید نہیں کھولتی بلکہ اختر حسین جعفری کی شعری شخصیت کے راز بھی منکشف کر رہی ہے۔ کاروانِ وجود تضادات کے بھنور میں چکراتا ڈولتا جس منزل کی طرف رواں ہے اُس پر غور و فکر کے دوران مسلمانوں نے جو فکری نظام مرتب کیا ہے اور اس فکری نظام کے زیرِ اثر جو شعری روایت وجود میں آئی ہے اسے ہمارے زمانے میں بڑی حد تک فراموش کر دیا گیا ہے مگر اُس شعری و فکری روایت سے اختر حسین جعفری کا پیمانِ وفا اُستوار ہے۔ یہاں کائنات تہ در تہ معانی سے لبریز ہے اور "ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک"۔ چنانچہ "منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ"۔ شاعر" ہوا سے ستارے کی گفتگو، پھول سے دھنک کا مکالمہ کہیں پورا کہیں ادھورا —— اور پیوندگی چادر کی دھواں چھوڑتی ملوں سے شکایت" سنتا ہے اور" نوکِ مژہ پر ہویدا اشک سے پسِ حجاب کلام کرنے" اور" برگِ گل پر متحیر شبنم سے ہزار ہا سورجوں کی تمازتوں کے درمیان زندہ[1] رہنے" کی تعلیم پاتا ہے۔ اس شعری روایت سے منکشف شاعر زمین، ہوا، پھول ستارے، بادل اور دھنک کے جوابات میں مستور معنی کائنات سے یوں ہمکلام ہوتا ہے:

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

یہ شعر غالب کا ہے اور مجھے اس وقت یوں یاد آیا ہے کہ ہر چند عہدِ حاضر کی شاعری من و تو کے اُس تصور سے بڑی حد تک ناآشنا ہے مگر اختر حسین جعفری کی شاعری اس نورِ من و تو سے محروم نہیں ہے۔ مسلمانوں کے فلسفۂ عشق سے پھوٹنے والے حقیقت و مجاز کے تصورات ہی اختر حسین جعفری کی شاعرانہ شخصیت کا تار و پود ہیں مگر وہ عصری زندگی اور علوم کے حوالے سے ان تصورات کے تازہ تعینات کا اظہار مولانا روم کی طرح مثنوی میں یا مرزا غالب کی طرح غزل میں نہیں بلکہ ایذرا پاؤنڈ کے کینٹوز میں کرتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اختر نظمِ جدید کی تازہ تر ہیئتوں کو آزماتے وقت بھی تغزل کی روایت سے انحراف نہیں کرتا اور عارضی میں ابدی کی اور مادیت میں ماورائیت کی جھلک دیکھنے اور دکھانے کے لئے

---

[1] زمین کا اوّلین مکتوب۔ ابتدائیہ۔ آئینہ خانہ۔

مسلموں کی صوفیانہ اور حکیمانہ شاعری سے آئینے کا استعارہ اخذ کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مغربی عقلیت پسندی کے پتھروں کی زد میں آ کر جس مثالی دار آئینے کے ٹوٹ جانے پر غالب کی زندگی عالم یک شہرِ آرزو بن کر رہ گئی تھی اختر حسین جعفری نے اسے پھر سے ثابت و سالم کرنے کی کوشش کی ہے۔ طویل نظم "آئینہ خانہ" اسی تخلیقی مہم کا بہترین ثمر ہے۔ اس کے نزدیک:

"آفتاب اور مہتاب کے آئینے صرف وہی تصویریں، وہی اشکال اور وہی چہرے دکھاتے ہیں، انہی اعداد کی تفہیم کراتے ہیں جنہیں کورچشم دیکھنا اور سمجھنا چاہیں ——— اور زمین پر اب تک صلیب کی صورت وہی میزان ٹنگی ہے، جس کے پلڑے ہر راست فکر کی عمودی قوت کے منکر ہیں۔ اسی میزان کے ایک پلڑے میں انسان ایک یرغمالی کی صورت زندہ اپنی رہائی کی قیمت پوچھ رہا ہے"[1]

آفاق میں انسان کے اس المناک مقدر کو اختر حسین جعفری "اپنی قومی تاریخ کے استحصالی مناظر" میں سمجھتا اور پیش کرتا ہے۔ اس کے آئینہ خانہ میں جو مختلف اور متنوع مناظر جلوہ گر ہیں ان سے ایک ایسے عہدِ منحرف کی تصویر ابھرتی ہے جہاں سپیدۂ سحری میں ظلمت گھلی ہوئی ہے تو حلقۂ نور کے اردگرد اندھیرے خیمہ زن ہیں۔ جہاں گلی گلی میں ہراساں پیغمبروں کی آواز گونج رہی ہے تو پرندے آب و ضو کو ترس رہے ہیں۔ جہاں خاکِ شفا کا سینہ زہر میں بجھے خنجروں کا ہدف ہے تو حدِ نظر تک شکستہ خول، کھلی بکتریں، جلے ہتھیار بکھرے پڑے ہیں۔ جہاں انسان یرغمالی ہے یا بقا کی جنگ کا ہارا ہوا سپاہی اور جہاں:

سفر کی رات تعاقب میں ہے سگِ عامور
نشانِ پا سے سراغِ بدن نکالے گا
مدد کرے گا عدو کی، نکل کے ابر سے چاند
دکھائے گا کہ سبھی ہست و بود کی راہیں
قدم قدم پہ انہی جنگلوں سے ملتی ہیں
جہاں پہ ڈھونڈی ہے مفرور قیدیوں نے پناہ
اُفق اُٹھائیں گے پھر سے کوئی نئی دیوار
بُنیں گے غول بیابان بارِ لوہے کی
ہوا کہے گی کہ خود یافتی کی منزل پر
فصیلِ ذات سے محکم کوئی فصیل نہیں

اختر حسین جعفری خود یافتی کی منزل اپنے عہد کے سیاق و سباق میں، جسے وہ کبھی عہدِ ملامت کا نام دیتا ہے تو کبھی عہدِ خجالت کا، سر کرنے کا تمنائی ہے۔ آئینہ کو اپنی شاعری کا مرکزی استعارہ بنا کر وہ "طلسمِ پسِ نگاہ" کھولنے اور "حجابات شاہد و مشہود" اٹھانے میں کوشاں ہے۔ نظم آئینہ خانہ میں موضوعات کی کثرت کو جو ازلی و ابدی سوال وحدت بخشتا ہے اسے اقبال نے ان لفظوں کا قالب دیا ہے:

میں کہاں ہوں؟ تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے؟
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی؟

من و تو اور مکاں و لامکاں کے پیرستہ روحانی رازوں کے انکشاف کی تمنا میں اختر حسین جعفری مادی دنیا سے فرار کا راستہ اختیار نہیں

---

[1] زمین کا آدلین مکتوب ——— ابتدائیہ آئینہ خانہ۔

کرتا بلکہ انسانی زندگی کے حسّی مطالبات کے حسن میں ہی حُسنِ ازل کی جھلک دیکھتا ہے اور معاشرتی و سیاسی حقائق کے تصادم میں ہی حقیقتِ مطلق کا متلاشی ہے۔ وہ کارزارِ حیات کا خاموش تماشائی نہیں بلکہ زندہ، متحرک اور جارحانہ عزائم کے ساتھ اس جنگاہ میں شریک ہے:

اک اور شورِ قیامت کہ بندِ قبر کھلے
اک اور ضرب کہ تمثال دارِ آئینہ
تمام عکسِ مکرر ترے رہا کر دے
اک اور ضرب کہ بُود و نبُود کی تقسیم
اسی فصیل، اسی خشتِ ماسوا تک ہے
قدم اک اور کہ اُس کاخ و کو میں روشن ہے
وہ ہفت رنگ ستارہ جو آسماں میں نہیں
ہمارے ساتھ غریب الدیار جس کے لئے
دنوں کی شاخِ برہنہ، شبوں کی زلفِ تہی
قدم اک اور کہ آگے وہ معرکہ ہے جہاں
صداقتوں کے مقابل صداقتیں ہوں گی

اختر حسین جعفری من و تُو کے مابعد الطبیعاتی ابعاد پر غور و فکر کرتے وقت مادیت کی چمن آرائی کا احساس اپنے اندر زندہ رکھتے ہیں۔ کہاں ہے جوہرِ صورت کہاں سرِ معنی؟ اختر کا تجسس خدا کی تلاش میں نکلتا ہے تو خلقِ خدا سے اپنا رشتہ مزید استوار کر لیتا ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا تھا:

بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم

اختر حسین جعفری کے حوصلۂ عشق کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے ہاں صوفیانہ احساس اور سیاسی شعور شیر و شکر ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے خیال میں تو "روحِ عصر اس کی ایک ایک سطر، ایک ایک لفظ سے جھانکتی نظر آتی ہے"۔ ہمارے عصری مصائب کا جو سچا، گہرا اور فن کارانہ احساس اختر حسین جعفری کی شاعری میں جلوہ گر ہے وہ آج کی شاعری میں بڑی حد تک نایاب ہے۔ سلطانی جمہور کے خوابوں کی شکست کے موضوع پر اُس کی متعدد نظموں میں سے ایک ملاحظہ ہو:

اب نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
اب کسی اجداد سے زنہار ستم کھلتے نہیں
سبز سجادوں پہ بیٹھی بیبیوں نے
جس قدر حرفِ عبادت یاد تھے، پو پھٹے تک اُنگلیوں پر گن لئے
اور دیکھا —— رحل کے نیچے لہو ہے
شیشۂ محفوظ کی مٹی ہے سرخ
سطرِ مستحکم کے اندر بست و در باقی نہیں
یا الٰہی مرگِ یوسف کی خبر سچی نہ ہو

ایلچی کیسے بلادِ مصر سے
سوئے کنعاں آتے ہیں
اک جنوسِ بے تماشا کھیوں بازاروں میں ہے
تعزیہ بر دوشِ انبوہِ ہوا
روزنوں میں سر برہنہ مائیں جس سے مانگتی ہیں، منتوں کا اجر
خوابوں کی زکوٰۃ

بسترِ سجادوں پہ بیٹھی بیبیو!
اب کسی ابجد سے زندانِ ستم کھلتے نہیں
اب سمیٹو مشک و عنبر، دھانپ دو لوحِ و قلم
اشک پونچھو اور ردائیں نوکِ پا تک کھینچ لو
کچی آنکھوں سے جنازے دیکھنا اچھا نہیں

(نوحہ)

انسان کے جبلّی جذبات کی مصوری ہو یا اس کے اجتماعی مقدر کا انکشاف ہو، اختر کے ہاں شاعری مرصع سازی کا عمل ہے۔ اُس کی نظمیں مکمل ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ناتمامی کا ایک حسین احساس رکھتی ہیں اور وہ داستگاف نگاری کی بجائے استعاروں اور علامتوں میں بات کرتا ہے۔ وہ اپنے شاعرانہ طریقِ کار کے بارے میں عطاالحق قاسمی کے ایک سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ:

"اظہار میں اپنی شخصی اور شعری صداقت کے لئے ضروری ہے کہ فن کار اُن علامتوں اور استعاروں سے کام لے جو اُس کی تاریخ اور تہذیب کا بنیادی حصہ ہیں۔ لہٰذا اگر میں نے اپنی شاعری میں کربلا کے استعارے اور مسلمانوں کے عروج و زوال اور اُن کی نصرتوں اور ہزیمتوں کے واقعات کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے تو اس لئے کہ اس کے بغیر نہ میری پہچان ہوتی ہے نہ میرے فن کی اور نہ اُس زبان کی جس میں میں شعر کہتا ہوں۔ شاعر کے پاس اُس کا شناختی کارڈ ہونا چاہیئے۔ قوموں کا ماضی خواہ وہ شکستہ ہو یا نصرتوں سے پُر ہو، وہ لمحۂ موجود کی تفہیم کے لئے ایک ضروری استعارہ ہوتا ہے کیونکہ اس کے بغیر حال اور مستقبل کے خواب نہیں دیکھے جا سکتے۔"[1]

یہ طرزِ فکر اُس طرزِ فکر کی ضد ہے جس کا پرچم لے کر نئی نظم نمودار ہوئی تھی۔ اب سے پچاس برس پہلے میراجی اور راشد نے نئی نظم کی ترویج کے لئے مروجہ شعری ہیئتوں سے بے زاری کا اعلان کرتے وقت اپنی تاریخی اور تہذیبی روایات کے خلاف کچھ اس زور شور سے علمِ بغاوت بلند کیا تھا کہ رجعت پسندی اور اپنی تاریخ و تہذیب سے بیزاری ہم معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر اختر حسین جعفری نئی نظم کی ہیئت کے تازہ تر امکانات کو بروئے کار لاتے وقت اپنی تاریخ اور تہذیب کو فراموش نہیں کرتا اور عصرِ رواں کے کرب و الم کو اسلامی استعاروں اور علامتوں میں بیان کرتا ہے —— ہے نا عجب شاعر!

---

[1] اختر حسین جعفری سے ایک ملاقات۔ نوائے وقت، لاہور۔ ادبی ایڈیشن۔

اختر حسین جعفری | کچھ باتیں، کچھ یادیں

ستّار طاہر

اور میں ارشد میر کے ساتھ اختر حسین جعفری کے گھر بیٹھا تھا اور بات جدید شاعری پر ہو رہی تھی.....

اب نہ ارشد میر اس دنیا میں ہیں نہ اختر حسین جعفری، مگر جب بھی جدید نظم کا ذکر ہوگا، اختر حسین جعفری کا ذکر ضرور ہوگا۔

ان کی موت سے چند دن پہلے کی بات ہے کہ اردو کے ایک شاعر سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تو انھوں نے کہا "وہ جسے نظم کا سب سے بڑا شاعر کہتے ہیں، اس کا حال یہ ہے کہ نظم ابتدائی مصرعوں کے بعد پٹڑی سے اتر جاتی ہے.....،،

میں ایسے غیر ذمہ دارانہ بیان پر جھنجھلا اٹھا اور ان صاحب سے کہا "صاحب، اتنا بڑا جھوٹ میں نے شاید ہی سنا ہو۔ آپ مجھے اختر حسین جعفری کی کوئی ایک ایسی نظم بتائیں جہاں شاعر چند مصرعوں کے بعد بقول آپ کے پٹڑی سے اتر گیا ہو"

وہ کوئی حوالہ نہ دے سکے کہ حوالہ دے نہیں سکتے تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ اُن کی کس کس نظم میں کس کس غیر ملکی شاعر کی نظموں کے "آزاد اردو ترجمے" شامل ہیں...

کہنے لگے میں پھر کبھی بات کروں گا....

میں نے عرض کیا۔ "وہ ٹکڑے داوین میں نہیں ہیں اور ویسے بھی آپ کے قبیلے میں حوالہ دینا اور گول کر جانا روایت بن چکا ہے"۔

فون بند کر دیا گیا!

'آئینہ خانہ' کی ایک جلد مجھے اختر حسین جعفری نے بہت محبت سے پیش کی۔ میں نے 'تخلیق' میں اس پر ایک مختصر نوٹ بھی لکھا۔ جدید نظم میں اسے ایک بڑا اضافہ قرار دیا اور وعدہ کیا کہ اس پر تفصیل سے کبھی لکھوں گا... اصل میں میرے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہے کہ میں بہت سے ناگوار تجربات اور شواہد کے بارے میں اب بھی خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہوں کہ پڑھنے لکھنے والے لوگ، شاعر ادیب اور نقاد خواہ کتنے ہی گروہوں میں کیوں نہ بٹے ہوں، وہ اچھی تخلیق کی داد ضرور دیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ کم از کم شعر اور ادب کا صحیح ذوق رکھنے والے لوگوں میں تو کسی تخلیق کی کسی طرف سے تحسین کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ اچھا ذوق رکھنے والا تو کسی بیرونی تحسین کے بغیر بھی بڑی تخلیق کو سراہتا ہے....

اب میری بہت سی خوش فہمیوں کی طرح یہ خوش فہمی بھی متزلزل ہو گئی ہے اور کبھی کبھی میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اچھا ذوق رکھنے والے لوگ اب نقادوں اور ادیبوں میں کم ہو گئے ہیں....

اختر حسین جعفری سے میں نے ایک بار ایسی ہی بات کہی تو کہنے لگے "آپ میری شاعری کو پسند کرتے ہیں میرے لئے اتنا ہی کافی ہے خواہ آپ لکھیں یا نہ لکھیں..... آپ کی مرضی ....،،

اختر حسین جعفری بہت بڑے شاعر تھے۔ جدید نظم میں کوئی ان کا ہمسر دکھائی نہیں دیتا۔ اب اگر کوئی ان کی شاعری کے بارے میں دوسری رائے رکھتا ہے تو وہ یا تو منافق ہے یا پھر.... اس کا اپنا شعری ذوق پست ہے۔

محمد ہارون سعد امروز کے چیف ایڈیٹر تھے۔ اہل قلم کانفرنس کے ایک اجتماع کے حوالے سے "امروز" میں میرے کالم "حلقۂ دام خیال" میں اس کانفرنس میں جنرل ضیاء الحق کا ذکر اس حوالے سے ہوا کہ انھوں نے شرکا سے کہا تھا کہ چونکہ وہ ان کا نمک کھا رہے ہیں اس لیے وہ حق نمک ہی ادا کریں۔ میں نے اس پر ہیمنگوے کے حوالے سے لکھا کہ جنرل صاحب کو اپنی اس "فتح" کا جشن منانے کا حق حاصل ہے کہ اب وہ ملک کے شاعروں مصنفوں کو بھی اپنا نمک کھانے لگ گئے ہیں۔ کالم ظاہر ہے چھپ گیا۔ اظہر جاوید صاحب بیمار تھے۔ ان کی فراخ دلی کی بدولت .... بعد میں ہارون سعد صاحب سے ملاقات ہوئی تو اس کالم کی اشاعت پر ہی ناراض نہیں تھے بلکہ ایسا کالم لکھنے پر بھی خفا تھے....

میں سنتا رہا۔ پھر عرض کیا ..."آپ جانتے ہیں کہ اس اہل قلم کانفرنس میں آپ کے جنرل صاحب کا رویہ کیا تھا ..... اردو کے سب سے اچھے نظم لکھنے والے شاعر کی ایک نظم کا ٹکڑا جنرل صاحب نے دوسرے شاعروں کی تخلیقات کے ساتھ بھی Quote کیا۔ اور نظم جو اس عہد کی بہت خوبصورت، سچی اور نمائندہ نظم تھی اس کو غلط معنی پہنائے گئے اور شاعر جو وہاں موجود تھا۔ اس پر دل کا دورہ پڑا....."

ہارون سعد کہنے لگے "ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں..." میں نے عرض کیا "آپ کے علم میں بہت سی باتیں نہیں حالانکہ آپ ایک اخبار کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ وہ شاعر جنھیں دل کا دورہ پڑا، اختر حسین جعفری تھے جن کی نظم کو غلط معنی پہنا کر آپ کے جنرل صاحب نے ان کے علاوہ دوسرے لکھنے والوں کو بھی دھمکیاں دی تھیں"۔

اور اس شام گوجرانوالہ میں ارشد میر، اختر حسین جعفری کے گھر ان کے سامنے مجھے بتا رہے تھے کہ اختر حسین جعفری کس طرح ہارٹ اٹیک برداشت کر گئے اور اس وقت ان کی حالت کتنی نازک تھی۔ ارشد میر میرے اصرار پر تفصیل بتا رہے تھے اور اختر حسین جعفری بار بار ٹوک رہے تھے اور اس موضوع کو ختم کرانا چاہتے تھے....

اور پھر بات ایذرا پاؤنڈ پر ہونے لگی۔ "آئینہ خانہ" میں ایذرا پاؤنڈ کی موت پر اختر حسین جعفری کی ایک خوبصورت نظم شامل ہے ..... ایذرا پاؤنڈ کے کینٹوز پر اس شام دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہو جاتا ہوں (حالانکہ وہ چھوٹی باتیں ہوتی نہیں ہوتی ہیں) اختر حسین جعفری نے جب ان کینٹوز کا ذکر بھی کیا۔ جن میں ایذرا پاؤنڈ نے اپنے معاشی نظریات بیان کرتے ہوئے امریکہ کے نظام زر کی شدید مذمت کی ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی ـــــ صرف میں ہی نہیں، کوئی اور بھی ہے جس نے ایذرا پاؤنڈ کو ایسی توجہ سے پڑھا ہے۔ (یہ خود ستائی کی بات نہیں۔ اس سے پہلے جب کبھی کسی سے ایذرا پاؤنڈ کے کینٹوز پر بات ہوئی تھی، کسی پڑھے لکھے نے ان کینٹوز کا تذکرہ نہ کیا تھا جن کا میں نے حوالہ دیا ہے۔ جب کبھی نشاندہی کی تو ایذرا پاؤنڈ کے اس مداح نے صاف اقرار کیا کہ اس نے اس کے پورے کینٹوز نہیں پڑھے ... مظفر علی سید سے بہت برسوں کے بعد ایذرا پاؤنڈ پر بات ہوئی تو جب انھوں نے ان کینٹوز کا ذکر کیا جو میرے اور اختر حسین جعفری کے مابین اس نشست میں زیر بحث آئے تھے تو مجھے ایک بار پھر بہت مسرت ہوئی تھی۔)

اظہر جاوید نے مجھے بتایا کہ اپنی وفات سے چند روز پہلے انھوں نے کہا تھا کہ میری ان کی ملاقات میں طویل وقفہ آ گیا ہے۔ وہ مجھے جلد ملیں گے

اب ہماری ملاقات نہ ہو سکے گی لیکن جب تک میں زندہ ہوں ملاقات کی ایک صورت ان کی شاعری کے ذریعے تو قائم رہے گی۔

وہ بہت بڑے نظم گو تھے۔ منفرد... اپنا اسلوب تھا... ان کے ہاں آج کے بیشتر جدید اردو شاعروں کی طرح غیر ملکی شاعروں کے نہ خیالات ملتے ہیں نہ مصرعے ..... میں بیسیوں مثالیں دے سکتا ہوں ان جدید نظموں کی جن میں ہمارے شاعروں نے خود کچھ نہیں کیا۔ بس مصرعے چرائے ہیں اور بیرونی شاعروں کی جگالی کی ہے۔ اس کے باوجود وہ بڑے شاعر کہلاتے ہیں۔

اختر حسین جعفری ایسے شاعر نہیں تھے۔

جدید شعری ادب میں مزاحمتی شاعری اور ادب کے حوالے سے بھی بہت سے لوگوں کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ حتیٰ کہ تراجم کرنے والوں کو بھی بڑا مزاحمتی شاعر قرار دیا گیا تھا... اختر حسین جعفری ایسے مزاحمتی شاعری کرنے والے شاعر بھی نہیں تھے۔ حالانکہ وہ جدید اور مزاحمتی شاعری کے سب سے نمایاں شاعر ہیں ....

ایڈورڈ البی نے زیادہ شہرت اپنے ڈرامے "ہو از آفریڈ آف ورجینا وولف" سے پائی ہے.... اس کے دو ڈرامے جو ایک دوسرے سے جڑے سے ہوئے ہیں... ان کے نام Box اور Quotations from MAO TSE TUNG ہیں۔ میں نہیں جانتا انھیں کتنے لوگوں نے پڑھا ہے Box کے تعارف میں البی نے لکھا ہے — کچھ لوگ فراری قسم کے رومان بھی لکھتے ہیں... جو اپنی جگہ قابلِ احترام کام ہے لیکن اصل کام تو کچھ اور ہے۔ لکھنے والا پہلے تو انسان کی اس صورت حال کے بارے میں بیان دیتا ہے... ان دونوں تخلیقی بیانوں میں... وہ تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ میں....

"ہر برا لکھنے والا سٹیٹس کو کا مخالف ہوتا ہے۔ وہ تبدیلی چاہتا ہے .... بڑے لکھنے والے کی پہلی پہچان یہ ہے اور دوسری اس کا آرٹ جس کے ذریعے وہ تبدیلی کا اظہار کرتا ہے"!

اختر حسین جعفری جدید نظم کے اہم ترین شاعر تھے۔ وہ ہر بڑے لکھنے والے کی طرح سٹیٹس کو کے مخالف تھے۔ مزاحمت کرتے تھے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ان کا آرٹ عظیم تھا۔

"آئینہ خانہ" اور اس کے بعد کی نظمیں اس کی شہادت دیتی ہیں۔!!

شاداب ذوق نمو کے شاعر

اختر ضیائی

کا تیسرا مجموعۂ کلام

اجنبی موسموں کی خوشبو شائع ہو گیا ہے

جس میں ان کی تازہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

سنگِ میل پبلیکیشنز، چوک اردو بازار، لاہور

دہلیز پر آنکھیں

جدید شاعری کا خوبصورت مجموعہ

شاعر: جواز جعفری

جنگ پبلشرز، لاہور

جاں دادہ ہوائے سرِ رہگزار تھا

شبنم شکیل

خواتین و حضرات۔ اختر حسین جعفری مر گئے اور مجھے مرنا ہے۔ ایسی کیفیت میں اکثر نادانستہ طور پر بھی انسان کی زبان سے سچ بات نکل جایا کرتی ہے۔ سو اگر میں یہ کہوں کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں سچ پر نہیں، عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہوں اور میں نے دل ہی دل میں حلف اٹھا لیا ہے کہ "میں سچ کہوں گی اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی" تو اسے جھوٹ نہ جانئے گا۔ جعفری صاحب سے میری بانشافہ اور فون کے ذریعے بہت طویل گفتگو رہتی تھی۔ مگر اس طرح کہ بات وہ کرتے تھے اور میں گوش برآواز رہتی تھی۔ اکثر و بیشتر ان کی گفتگو کا موضوع "موجودہ ادبی فضا" ہوتا۔ یہ باتیں وہ اوروں سے بھی کرتے ہوں گے لیکن مجھ سے مخاطب ہونے کی ایک خاص وجہ تھی۔ یہ وجہ کیا تھی میں اسے آخر میں بتاؤں گی کیونکہ ہو سکتا ہے اسے سننے کے بعد آپ لوگ میری تقریر سننا ہی گوارا نہ کریں۔

وہ کہتے تھے "موجودہ ادبی ماحول" کسی "جینوائن" ادیب کے لئے سازگار نہیں ہے۔ ادبی سرگرمیوں کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی حال میں ادب کے زمرے میں نہیں آتا۔ خاموشی سے الگ تھلگ بیٹھ کر سنجیدہ تخلیقی کام کرنے والے اس صورت حال پر حیران ہیں اور کچھ دل برداشتہ بھی۔ اگرچہ ہر دور ادبی کارنامہ بذاتِ خود ایک مسئلہ ہوتا ہے اور ہر عہد میں بڑے ادیبوں کو اسی ایک مسئلے کے لئے جنم لینا ہوتا ہے لیکن دل برداشتگی بھی ساتھ ساتھ ان کا مقدر رہتی ہے کہ وہ بہر طور اسی دنیا کے باسی ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں ادبی فضا چونکہ کچھ زیادہ ہی تیزی سے انحطاط کا شکار ہو رہی ہے اور اس کے انسداد کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا رہا بلکہ اس ذہنی کھوکھلے پن کو "فلورشن" کرتا دیکھ کر کئی کوارٹرز سے مسرت کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے اس لئے "جینوائن" ادیبوں کا کہ جو معدودے چند ہیں، دل برداشتہ ہونا فطری عمل ہے۔

موجودہ دور میں بہت سے لکھنے والے (کہ انہیں ادیب کہنا غلط ہوگا) شہرت اور ذاتی فائدے کے لئے ایسی ایسی حرکتوں کو بھی روا رکھے ہوئے ہیں جو کم از کم کسی سچے ادیب کا منصب نہیں۔ ستائش باہمی کی انجمنوں کے وجود نے، جن میں "من تُرا حاجی بگویم" والے مقولے پر عمل کیا جاتا ہے، سوچ کے سطحی پن کو فروغ دینے میں بہت فعال کردار ادا کیا ہے۔ خوشامد پروری کی روایت کچھ نئی تو نہیں ہے لیکن آج اچھے ادیبوں کو نظر انداز کرنے کی باقاعدہ مہم چلائی جاتی ہے اور اس کے گُر سکھانے کے لئے کئی تربیتی ادارے قائم ہیں۔

یوں بھی اب لکھنے والے اپنی تحریر سے نہیں، اپنی تصویر سے منظرِ عام پر آنا پسند کرتے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں جب ادیب اپنی تخلیقات کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے۔ اور چونکہ بہت سے لکھنے والے ذاتی تشہیر سے ذاتی مفاد تک کا فاصلہ جلد از جلد طے کرنا چاہتے ہیں، اس لئے وہ ہمہ وقت اس کھوج میں رہتے ہیں کہ ریڈیو، ٹی وی، اخبار کے ادبی صفحات اور مختلف رسالوں تک رسائی کس چینل اور کس گروہ کو "آپریٹ" کرنے سے ہوگی۔ اندروں اور بیرونِ ملک شاعروں، کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کا پروانہ حاصل کرنے کے لئے کون سے ذرائع بروئے کار لانے ہوں گے۔

یہ وہ موضوعات تھے جس پر جعفری صاحب اظہارِ خیال کرتے رہتے تھے لیکن چونکہ وہ ایک سچے، کھرے اور دیانت دار شاعر تھے اس لئے ان کی باتوں میں گلے شکوے کا پہلو کم، بہت ہی کم ہوتا تھا۔ یہ گفتگو وہ اکیڈیمک انٹرسٹ کے نقطۂ نظر سے کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

اب آخر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں کرتے ہوئے وہ مجھ سے کیوں مخاطب ہوتے تھے۔ مجھ کو کیوں منتخب کرتے تھے۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ وہ مجھے بھی ادیبوں میں نہیں بلکہ آج کے بہت سے دوسرے لکھنے والے چھوٹے بیٹیوں ہی میں شمار کرتے تھے۔

(ایک تعزیتی اجلاس میں پڑھا گیا)

حسن ناصر

نوحہ گر کا نوحہ

برادر گرامی اختر حسین جعفری کی بے وقت موت پر

(" مدار ذات کے اندر رُکے ہوئے سورج ")

ترا وجود مری دسترس سے باہر ہے
ذرا سی دیر کہ میں روشنی کا کش لے لوں
بس ایک کش کہ یہی آخری سوال مرا
جواب اس کا ستارہ شناس ڈھونڈیں گے
ابھی تو میتیں قبروں کے پاس رکھی ہیں
بلادِ گل سے ابھی چادریں نہیں آئیں
درونِ قلب مفید ہے سینہ چاک صدا
ہوائیں ڈھونڈ رہی ہیں وہ نوحہ گر جس نے
تنِ گلاب پہ چھڑکا تھا رنگ و بو کا لہو
کسی فریم میں تصویر اب نہیں باقی
ہر ایک آئینہ محرومِ رنگِ عکسِ جمال
محبتوں کا پیامی، سخنوروں کا امام
کہاں پہ کھو گیا آہنگ حرف و معنی کا
درِ قبول پہ بیٹھے ہیں پہرہ دار مگر
ہر ایک آنکھ سے بہتی دعائیں کہتی ہیں
خدا کرے کہ یہ خبریں تمام جھوٹی ہوں

---

٥ آئینہ خانہ ص ۲۴

صفدر صدیق رضی

اختر حسین جعفری کیلئے ایک نظم

(حرف و صوت کا خالق)

خدا بھی خوش نہیں ہوتا
کہ یہ اس دشتِ امکانات میں
اُس کے نمائندے ہیں
جو اُس کی شہادت کی روپہلی روشنی
اس کی ہدایت کی مہک
اس تیرہ و بے رنگ قریے میں
صدا پھیلانے آتے ہیں
یہ پھولوں کی طرح کھلتے ہیں
اور آفاق پر رنگِ شفق بن کر اُبھرتے ہیں
سوائے دوست
(اک ترے جانے کے بعد)
اس بزمِ حرف و صوت میں
ہم بھی بہت ناشاد بیٹھے ہیں
کہ اک پھول اور مرجھایا
کہ اک خوشبو تھی جو رخصت ہوئی
ہم تو اسی پھول اور خوشبو کی وساطت سے
خدا کو جانتے ہیں
اور یہی اُس خالقِ نیرنگِ ہستی کا تعارف ہے

احمد لطیف

نہیں سمجھتا

جعفری صاحب کا نوحہ

ہلالِ ذوالحج دلوں میں اُترا
کہ اب کے اَن ہونیاں ہوئی ہیں
ہُوا ہے معکوس نظمِ ہستی
جگر پہ لختِ جگر جُھکا ہے
کہ اب کے عشرہ عجیب اُترا
نہ دیکھ پائے گا کوئی خیموں کی سمت اب کے
کہ "نہر اب بھی پرانے پہرے پہ چل رہی ہے
خزاں کا پانی کوئی اشارہ نہیں سمجھتا"

نہیں سمجھتا
یہ دل ہمارا نہیں سمجھتا
دھڑک رہا ہے
دھڑک رہا ہے
نجانے کیونکر دھڑک رہا ہے

بجھی سی رنگت لہو میں رکھے
لہو میں رکھے تمہاری یادیں
لہو کا لہرا
کوئی اشارہ نہیں سمجھتا
وصالِ اختر میں اُچھلا جائے
زمیں کا ذرّہ
فلک پہ آنکھیں اُتارتا ہے
نہیں سمجھتا

ہلالِ ذوالحج ہُوا محرم کا چاند اب کے
کہ نجمِ منظوم آج طرفہ مدار میں ہے
نہیں سمجھتا
کوئی اشارہ نہیں سمجھتا

احمد لطیف

نم دیدہ چُپ کے نام

بیاد اختر حسین جعفری

کوئی پھُول بھُول کے رہ گیا
کوئی جیتے جی بھی نہ جی سکا
کوئی مر کے بھی نہیں مر سکا
ہمیں کیا خبر
ہمیں کیا پتا
کہ روش روش وہ گلاب ہے
کوئی رنگ اُچھال کہ زندگی
ترے روپ میں
ترے رنگ میں
تری صبح میں — تری دُھوپ میں
نہ نہا سکی
نہ سنور سکی
ہمیں کیا خبر — ہمیں کیا پتا
کہ زبانِ گُل نہ سمجھ سکے
اسے کیا کہیں
مگر اے ہوائے دریدہ سن!
کوئی در سجا
کہ نویدِ صبحِ جمال کی بھی سبیل ہو
اسے یہ کہو — ترے نظم کو
ابھی حرف لکھیں جلی، جری
اسے یہ کہو
کہ بُرا نہیں
وہ جو ترک تھا وہ بُرا نہیں
سبھی بھائی باہوں میں باہیں ڈالے جری صفت
اسی طور سینہ سپر رہے
کہ غنیم پیشہ فنا ہوئے
کوئی پھول ہے
کہ ستارا ہے
مری شاخِ حزن و ملال پر
کوئی پھُول بھُول کے رہ گیا
کہ دکانِ شیشہ پہ دُھول ہے
کہ تہی مژہ پہ چڑھا ہوا
کوئی تیر ہے — کوئی دِیر ہے
کھُلے بال ہیں
کھُلے بال ہیں سبھی بیبیاں
کوئی کیا رکھے گا ردا کہ اب
سبھی سمت کوفہ و نینوا
کہ سخن بھی صید نمی کا ہے
کھُلے بال ہیں
مٹے رنگ ہیں
کہ فضائیں بھی ہیں دھواں، دھواں
کوئی پھُول بھُول کے رہ گیا
کوئی پھُول بھُول کے رہ گیا

اعجاز رضوی

یہ مجھ سے کون بچھڑا ہے

جعفری صاحب کے لیے

مرے آنسو نہیں تھمتے
مجھے اپنی ہتھیلی کی حیات افزا لکیروں میں بھی
ظالم موت دِکھتی ہے

یہ مجھ سے کون بچھڑا ہے
کہ جس نے تیس برسوں میں جُدا ہوتے، بچھڑتے، رُوٹھتے
سب مہرباں چہرے بُھلائے ہیں
رگوں میں منجمد سیسہ پگھلتا ہے
قلم رک رک کے چلتا ہے
نجانے راہ میں کیسی رکاوٹ ہے
مجھے لگتا ہے جیسا کھی گری ہے اور سب نظمیں
کسی بوڑھی بھکارن کی طرح پیروں سرکتی ہیں
قلم رستا نہیں پاتا، میں خود سے مل نہیں پاتا
یہ مجھ سے کون بچھڑا ہے

احمد لطیف

ہمیں رستہ نہیں ملتا

اختر حسین جعفری کی یاد میں

نگر کو نُور سے کچھ دُور کرتا ہے
ترا بُجھنا

فصیلوں سے پرے پلتے اندھیرے
کون دیکھے گا

ندیم و آفتاب و کوثر و اختر

مرا سقفِ سخن جب ایسی دیواروں پہ رکھا ہے
تو اک دیوار ڈھے جانے سے
کیا خاک ٹھہرے گا!
گزرگہہ پر کوئی کیا ملکیت کا دعویٰ باندھے گا
ہمیں گلیوں کا تنکا کر گیا
اس نور کا بجھنا
ہمیں رستا نہیں ملتا
ہمیں رستا نہیں ملتا

اختر حسین جعفری کی شاعری کے ماخذات

آفتاب اقبال شمیم

اختر حسین جعفری ایک ایسا مشکل شاعر ہے جس کی نہ صرف نظموں بلکہ جدا جدا مصرعوں میں بھی تہہ داری نظر آتی ہے۔ لیکن وہ مشکل پسند شاعر نہیں۔ اس کی شاعری میں کسی مابعد الطبیعیاتی یا ارضی نظام فکر کا تذکرہ نہیں ملتا۔ نہ ہی وہ کہیں پر فکر و فلسفہ کے کسی پیچاک میں الجھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ ایک خالص شاعر ہے جو ہمیں اپنے زورِ تخلیق، تہذیب یافتہ احساسِ جمال اور اچھوتی ترکیب سازی کے کرشمے سے تسخیر کر لیتا ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ وہ ایک مشکل شاعر ہے جس کا سبب، میری رائے میں یہ ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک جدید شاعر ہے۔ اور جدید شاعر ہم اُسی کو کہتے ہیں جس میں روحِ عصر سرایت کر گئی ہو۔ اپنے دور کے مادی، فکری، جذباتی اور روحانی مسائل سے اس کی آشنائی وجودی سطح پر ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ اس دور کے گرہ دار مسائل کا ذکر تفصیل سے کیا جا سکے۔ مسائل کے اس ڈھیر سے بس ایک ہی مسئلہ اٹھا لیتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ آج کی منطقی تاویلوں میں خود لفظ معتبر نہیں رہا اور ہم بیک وقت ہندسے اور لفظ کی مختلف تہذیبوں میں بٹی ہوئی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اب اس ایک مسئلے پر شاعر کا ردِ عمل کیا ہو سکتا ہے؟ ایک شاعر وہ بھی ہے جو ایسے مسئلے کو خاطر میں ہی نہیں لاتا اور تقلیدِ روایت کی رَو میں بہہ نکلتا ہے۔ ایک شاعر وہ ہے جو اس مسئلے کو اپنے دور کا اہم مسئلہ سمجھتے ہوئے اپنے فہم و ادراک میں جذب کرتا ہے اور پھر وجدان کے جواب کا، ایک اضطراب کے عالم میں انتظار کرتا ہے۔ اختر حسین جعفری ایسا ہی شاعر ہے۔ اور اسی لئے وہ مشکل بھی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اختر حسین جعفری کی عصریت کے ماخذات کیا کیا ہیں۔

میرے خیال میں اُس پر اپنے دور کی تین ادبی اور فکری تحریریں اثر انداز ہوئیں اور ہر تحریک سے اُس نے پہلے سے موجود شعری مواد کی مناسبت سے اثر قبول کیا۔ اپنے ایک ریڈیو انٹرویو میں اختر حسین جعفری نے اپنے شعری سفر کے آغاز میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر آنے کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے ترقی پسندی کا سارا منشور تو قبول نہیں کیا ہوگا ورنہ وہ جدید شاعری تک نہ پہنچتا۔ اغلب ہے کہ وہ عالمی تناظر میں ادبی تخلیق کے ترقی پسندانہ رویّے سے متاثر ہوا ہوگا۔ دوسرے جیسا کہ اس کی شاعری شاہد ہے۔ اُس نے ہر طرح استبداد کے خلاف اور آزادیٔ فکر و نظر کے حق میں ترقی پسند نقطۂ نظر کو قبول کیا ہے۔ اس کی کئی ایک نظموں میں ہمارے عہد کی سیاسی صورتِ حال کے حوالے موجود ہیں۔ اس طرح سے بھی اس کی شاعری میں ایک ترقی پسند جہت کی نشاندہی ہوتی ہے۔

فنی اور جمالیاتی سطح پر جس تحریک نے اختر حسین جعفری کو متاثر کیا بلکہ بے حد متاثر کیا وہ مغرب کے علامت پسندوں اور علامت نگاروں کی تحریک تھی جس کا آغاز فرانسیسی ادیبوں نے کیا۔ بعد میں یہ تحریک ایذرا پاؤنڈ اور ٹی ایس ایلیٹ کے توسط سے اپنے عروج و کمال تک پہنچی۔ یہ تحریک ایک طرف تو رومان پسندوں کی جذباتی اور لفظی فضول خرچی اور بے اعتدالانہ آئیڈلزم کے خلاف بغاوت کے طور پر ابھری، دوسری طرف علامت پسندوں نے اس تحریک کے ذریعے مغربی استعمار کی بڑھتی ہوئی مادہ پرستی سے باواسطہ بیزاری اور خواہش فرار کا اظہار کیا۔ انھوں نے زمین سے بندھی ہوئی حقیقت پسندی اور حواس کی محدودیت سے ماورا ہو کر خالص وجدانی شاعری کی طرح ڈالی۔ اس شاعری میں موضوع سے زیادہ ہیئت کو اہم گردانا گیا۔ خیال کو دشنہ کی پردہ کر پیش کرنے کی پرانی روش کو معیوب سمجھا گیا۔ اسی مکتبِ فکر کے ایک نقاد نے تو یہاں تک کہا کہ ایک خیال جس کا ابلاغ آسانی سے ہو جائے بڑا خیال ہو ہی نہیں سکتا۔ اختر حسین جعفری اس تحریک سے یقیناً متاثر ہوا۔ اس نے اپنی نظم کو ایک نئی ہیئت دی اور ایک نئے شعری محاورے کی دریافت و ایجاد کی مساعی کیں۔ براہِ راست ابلاغ کی جگہ اس نے خیال اور تمثال کو محرکِ خیال بنایا۔ علامت اور تلازمے سے نظم میں زمانی فاصلوں کو مٹا کر جامعیت پیدا

کی۔ جذبات کی فضول خرچی، لفظ و اظہار کے اسراف سے جائے گریز کیا اور نظم کو نئی ہیئت سے روشناس کرانے کا آغاز اگرچہ میراجی نے کیا لیکن اس کی نظم میں آفاقی اور عصری سچائی سے کومٹ منٹ کی گئی تھی۔

اختر حسین جعفری نے اس نئی ہیئت کو ایک کومٹ منٹ کے ساتھ برتنے کے لئے ایک تیسری تحریک سے رابطہ کیا۔ یہ یورپ میں چلنے والی اخلاقی جہت یافتہ اور فکری تحریک وجودیت کے نام سے ظہور پذیر ہوئی تھی۔ اس تحریک نے مغرب کی تجاوز شدہ عقل پرستی کے ہاتھوں زندگی میں عدم وجود کے بڑھتے ہوئے خلا کی نشاندہی کی، بے معنویت کے کرب سے دوچار مغربی انسان کے نا انسان ہونے کے ہولناک نتائج کا احساس دلایا۔ مقراض خرد سے آدمی کے غیر عقلی حصوں کی کاٹ چھانٹ سے اُسے آدھا آدمی بنا دینے کے المیے سے اہل دانش کو روشناس کرایا اور وجود کو ایک کُل کے طور پر تسلیم کرنے کی تعلیم دی۔ اسی تحریک نے انسان کو اپنے ارادے اور فیصلے سے اپنی آزادیٔ عمل کو معنویت دینے کا درس دیا۔ اختر حسین جعفری نے اپنے آدرش سے کومٹ منٹ کا عندیہ اسی تحریک سے لیا۔ اُس نے اپنی شاعری کے خام مواد کو دیکھتے ہوئے محسوس کر لیا تھا کہ معاشرے اور تہذیبیں جب منجمد ہو جاتی ہیں تو وہ گرفت جبر میں آئے ہوئے رود فرات کا روپ دھار لیتی ہیں اور یہ بند نہر دوبارہ بہنے کے لئے حسینؑ کے خون کا تاوان طلب کرتی ہے اور اختر حسین جعفری کے نزدیک یہی وہ آفاقی سچائی ہے جو تمام عصری سچائیوں کا نقش اول ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان رشتے کے متن میں اس آفاقی سچائی کے اقرار سے ہی انسانیت کی ندی رواں دواں رہ سکتی ہے۔ یہی اختر حسین جعفری کی کومٹ منٹ ہے کہ حسین اثبات وجود کا نام ہے۔ یہ کومٹ منٹ اس کی شاعری کا مرکزہ ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اختر حسین جعفری نے متذکرہ تین تحریکوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی عصریت کا ثبوت دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی شاعری کے خام مواد کو شکل اور سمت دی ہے۔ یہ خام مواد کیا ہے؟ یہ خام مواد ایک طرف تو وہ حالات و مسائل ہیں جو شاعر کو اپنی زندگی میں درپیش رہے ہیں اور دوسری طرف وہ عربی اور عجمی روایت ہے جس سے شاعر کی شخصیت کا خمیر اٹھا ہے۔ یہ عربی اور عجمی عنصر اس کی شاعری میں پرت در پرت موجود ہے بلکہ اسی عنصر میں اُس کے متذکرہ تین تحریکوں کے بعض اجزا پہلے سے موجود پائے۔ مثلاً استبداد کی نفی اور صداقت کے ساتھ کومٹ منٹ، یا پھر اجتماعی ماضی کا زندگی کی حالت موجود سے موازنہ، یا پھر اپنی تہذیب سے اخذ کردہ تلازموں سے رفتہ اور حاضر کے درمیان ایک معنوی ربط پیدا کرنا۔ مثلاً کئی نظمیں جو آمریت کی تردید و انکار میں لکھی گئیں اسی عربی اور عجمی روایت کے سیاق و سباق میں شاعر کی کومٹ منٹ کا پتہ دیتی ہیں جیسن اور حسین ابن منصور وہ زندہ استعارے ہیں جنھیں سلاطین و شیوخ کے جبر نے مٹا کر زندہ جاوید کر دیا کیونکہ یہ چنانیں اُن کی موروثی یا شخصی بادشاہتوں کی راہ میں حائل تھیں۔ اور آمریت شخصی بادشاہت کی نئی شکل ہے جس میں خداوند رعایا سلیمانی تاج پہنتا ہے۔ وہ خود روپوش رہتا ہے اور اُس کا تاج حکومت کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

'آئینہ خانہ' اختر حسین جعفری کی مرکزی نظم ہے۔ اسے علامت و تمثال، استعارہ و تلازمہ سے جس ہنرمندی کے ساتھ سجایا گیا ہے، اس کی ہماری نظم میں شاید ہی کوئی مثال ہو۔ اگر ان ماضی و حال کے درمیان حرکت کرنے والے آئینوں میں عکس معنی دھندلایا ہوا ابھرتا ہے اور ابلاغ میں دشواری پیش آتی ہے تو اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم ایسی نظمیں پڑھنے کے عادی نہیں جو محرک خیال SUGGESTIVE ہوں اور جو معنی کی ترسیل ایک سطح پر نہیں بلکہ کئی سطحوں پر کریں دوسری وجہ یہ ہے کہ جدید شاعر کی اِسے بے نصیبی کہیئے کہ اُسے ابھی تک جدید نقاد نہیں ملا۔ اس سے پہلے ترقی پسندوں کو آل احمد سرور، احتشام حسین، ممتاز حسین اور اُن کے مخالفین میں کلیم الدین احمد جیسے پائے کے نقاد نصیب ہوئے۔ آئینہ خانہ ایک ایسے نقاد کے انتظار میں ہے جو اس کی سمتوں کو سمیٹ سکے۔ اس میں علامتوں اور تلازموں کے ماخذات کی نشان دہی کر سکے۔ بقول اختر حسین جعفری، انھوں نے اس نظم کی تالیف پر سات برس صرف کئے۔ اتنی بڑی کاوش کا یہ صلہ ناکافی ہے کہ اس پر واہ واہ کر دی جائے۔ ایلیٹ کی 'ویسٹ لینڈ' ایک انتہائی پیچیدہ تلازمہ خیال اور کم و بیش شعور کی رَو کی تکنیک پر لکھی ہوئی نظم ہے، انگریزی نقادوں کے ہاتھ لگ کر صم بکم کی طرح کھل گئی ہے۔ جدید شاعر کی تفہیم کے لئے ایک جدید نقاد کا وسیلہ نہایت ضروری ہے۔ اور جدید نقاد کے آنے تک اسے ہم شعری طلسم کے آئینہ خانے کے طور پر دیکھتے رہیں گے۔

کلاسیکی رکھ رکھاؤ کا حامل جدید شاعر — اختر حسین جعفری

ڈاکٹر سعادت سعید

جدید اردو نظم کی تاریخ اسالیبی رنگا رنگی سے مزین ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے پابند ہیئتوں میں آزاد مواد کو سمیٹا۔ حالی اور آزاد نے فطرت نگاری کے چمن کی آبیاری کی۔ اقبال نے فکر و فلسفہ اور تہذیبی تجزیوں کی آمیزش سے نظم کے نئے اور منفرد دبستان کی بنیاد ڈالی۔ اختر شیرانی نے رومانویت کے نخلستانوں کا احاطہ کیا۔ راشد نے آزاد نظم کی اوگھٹ گھاٹیوں کو طے کیا۔ جوش، فیض اور ندیم نے ترقی پسند نظم کے امکانات کو وجود بخشا۔ افتخار جالب نے نئی شاعری کا چراغ روشن کیا۔ میراجی، عزیز حامد مدنی، مختار صدیقی، مبارک جالندھری، مجید امجد، صفدر میر، جیلانی کامران، انیس ناگی، زاہد ڈار، کشور ناہید اور اختر حسین جعفری نے انفرادی حوالوں سے اردو نظم کو نئے ذائقوں سے شناسائی عطا کی۔ دیگر کئی نظم نگار شعراء نے بھی اپنی حدود میں رہتے ہوئے باغِ نظم میں نت نئی کیاریوں کی آبیاری کی۔ یہاں نظم نگاروں کی فہرست سازی مطلوب نہیں ہے۔ اصل تذکرہ منفرد نظمیہ اسالیب کا ہو رہا ہے۔ عوامی، فطرتی، رومانی، تعقلاتی، سماجی، سیاسی، ذاتی، آفاقی، وارداتی، احوالاتی، نفسیاتی اور فکری اسالیب سے اردو نظم کا دامن بہت وسیع ہو چکا ہے۔ یہ سب اقسام علیحدہ علیحدہ اور متنوع نئے آمیزوں کے ساتھ اردو قارئین کے سامنے آ چکی ہیں۔ اردو نظم کا مقبول ترین اسلوب رومانوی، سماجی اور سیاسی لہجوں سے تیار ہوا ہے لیکن شہرتِ عام کا ملنا ایک معاملہ ہے اور گہرائی کے حامل مواد اور اطوار سے فنی تخلیق کی آئینہ بندی سے عہدہ برآ ہونا دوسرا۔ اس رستے پر چلنے والے اظہار کی حسرت کے نوحہ خواں تو ہوتے ہی ہیں، روایتی مواد اور لہجوں کے گشتہ قاری کے لئے بھی مہم اور چیستاں بن جاتے ہیں۔ وہ جھیلوں، بارشوں، سمندروں، دریاؤں، پرندوں، موسموں، پھولوں، خوشگوار صبحوں اور سہانی شاموں کے رومانوی منظر نامے اس لئے رقم نہیں کرتے کہ انہیں عامیانہ مقبولیت کا خطرہ درپیش رہتا ہے، وہ اس خطرے کو بھانپ کر اس اقلیم میں قدم دھرنے سے گریز کرتے ہیں۔ مجرد منظر اور روایتی ہجر و وصال کی حکایتیں ان کے لئے بے کار ہوتی ہیں۔ ٹی وی فیم شاعروں اور "مشاعرہ لٹ" قسم شاعروں کی شاعری اٹھا کر دیکھ لیجئے میرے حرفوں کی صداقت آپ کا ضمیر بن جائے گی۔

شاعری اور چیز ہے اور جذباتی اور رومانوی یاوہ گوئی کچھ اور چیز۔ "چوما چاٹی" کہنے والے شاعر جدید دور میں بھی تو موجود ہیں۔ باطنی تجربوں، ذاتی وارداتوں، شعوری وسعتوں، فکری گہرائیوں اور جذباتی ندرتوں کی شاعری ہمارے قارئین کیا رومان دوست شاعروں کے لیے بھی کڑوا کسیلا گھونٹ ہو کے رہ جاتی ہے۔ فکر کو آزاد کرنا اور نئے میدانوں کی خبر لانا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ گنے چنے لفظوں کی اسیری انہیں خوش آتی ہے۔ نئے تجربے کے لئے نئے لفظ کی تلاش سے خوفزدہ رہنے والے شاعروں کی شاعری "دولا شاہی" شاعری ہوتی ہے یعنی وہ اپنے لفظوں کے سروں پر آہنی خود چڑھا کر مواد کی فکری وسعتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات پا لیتے ہیں۔ اگر شاعر برادری میں سے میری ان باتوں سے کسی کی دلآزاری ہوئی ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے کلام میں استعمال ہونے والے لفظوں کو آہنی خودوں سے آزاد کرے اور شعور کو کائنات کی وسعتوں میں پھیلنے دے۔ چند سکوں کی خاطر رات کو دن کا اجالا نہ کہے۔ مذبلوں میں رینگتے کیڑوں کو تتلیاں کہنے سے گریز کرے۔ غبار آلود صبحوں کو سہانا قرار نہ دے۔ آنسوؤں کے موسموں کو بہار نہ کہے۔ جبر کے ماحول سے آنکھیں چرا کر جابروں کے لئے "سب اچھا ہے" کا راگ نہ الاپے۔ الجھاؤ،

شکایتوں اور حقیقی حکایتوں پر مبنی شاعری کے بند دروازے کو کھولے۔ شہر آشوب لکھے۔ لمحہ لمحہ سوکھتے سمندر، پھٹے بادبان، خالی مکان، پیوند لگی چادر، گہناتے ہوئے مہتاب دیکھئے۔ اس کی شاعری میں ہواؤں، ستاروں، پھولوں اور طلوع ہوتے آفتابوں کا مفہوم یکسر تبدیل ہو جائے گا۔ اسے اپنے باطن سے نئی صدائیں سنائی دیں گی اور وہ اپنے استعارے اور علامتیں خود وضع کرے گا۔ اختر حسین جعفری نے یہی تو کیا تھا۔ لفظوں کے سروں سے آہنی خود اتارے تھے۔ تمام موسموں اور منظروں کو اپنے استعارے خود تخلیق کرنے کی بشارت دی تھی۔ اپنے دور کا آمر مطلق اور اس کے حواری یونہی تو نہیں چنچتے تھے۔ انہوں نے پھولوں کا تذکرہ کیا تھا لیکن بے گناہ شہیدوں کے لہو سے کھلنے والے پھولوں کا! انہوں نے نام نہاد اصلاحات کے دور میں رحل کے نیچے بہتا خون دیکھا تھا۔ وہ کیسے خوبصورت ساحلوں، دنیا و مافیہا سے بے خبر پرندوں کے گیتوں، خوشنما باغوں، نیلگوں جھیلوں میں تیرتی مرغابیوں پر رونق بازاروں، خوشبوؤں میں بسی گلیوں، مہکتی شبنمی فضاؤں، آزاد انسانوں اور آبرومند معاشروں کے قصیدے لکھتے۔ ان کی شاعری دغا کی شاموں، تشنہ لب ساعتوں، جلتے ہاتھوں، سزا کی رتوں، دکھ کی کالکوں، قاتل صبحوں، علامتی، عہدوں، جلے بادبانوں، سیاہ راتوں، خونی قلزموں، معتوب مجرموں، اشکوں کے خرمنوں اور گرم ہواؤں میں اڑتی تتلیوں نے کچھ اور حکایات کہی ہیں۔

اختر حسین جعفری کے "آئینہ خانے" میں داخل ہونے والے جن منظروں اور عکسوں کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ تفریحی اور نشاطی یا عشرتی نہیں ہیں، دل خون کرنے والے ہیں، درد آفریں ہیں کربلائی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ شاعر کے تخیل اور خواب کے آئینے ان تصویروں کو سامنے لا رہے ہیں جن سے بچ نکلنے میں کمرشل ادیبوں کا بھلا ہوتا ہے۔ اگر کسی علاقے سے آزادیٔ اظہار جیسی نعمت کو ختم کر دیا جائے تو حاکموں کے بنائے ہوئے وحشیانہ قوانین پر آزادی سے عمل درآمد ہوتا ہے۔ شاعر اور خصوصاً حقیقی شاعر ایسی صورت حال میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ اگر اقتدار کی جنگوں میں انسانی حقوق کے علمبردار مصلوب ہو جائیں تو عوام کو جابر ہاتھی کچل کر گزر جاتے ہیں۔ شاعر اور خصوصاً حقیقی شاعر ان منظروں پر چیخ اٹھتا ہے اور اپنے ضمیری آئینوں کو حقائق کے روبرو لے آتا ہے۔

اسی کے نام یہ تعویذ نافرستادہ
جسے لحد میں اترتے ہوئے نہیں دیکھا
اسی کی نذر فرو رفتۂ زمیں باغات
بچے ہوئے قفسِ عندلیب سے آنسو
اُگے ہوئے غمِ تشنہ زبان میں کانٹے
اسی کی نذر، رُکی آب جو، بہی دریا
جہاں طیور کو آبِ وضو نہیں ملتا

(آئینہ خانہ (۲۱))

اس مہینے کئی تشنہ لب ساعتوں، بے گناہی کے کتبے اٹھائے ہوئے
روز و شب بین کرتی ہیں دہلیز پر اور زنجیرِ در مجھ سے کھلتی نہیں
فرشِ ہموار پر پاؤں چلتا نہیں
دل دھڑکتا نہیں
اس مہینے میں گھر سے نکلتا نہیں

(امتناع کا مہینہ)

اسے یہ کہنا، لہو کا ہتھیار کند نکلا، مراجعت کی دعا نہ مانگے
اسے یہ کہنا کہ تیرا بیٹا نجات کی آرزو میں اس منزلِ دعا سے گزر گیا ہے
جہاں ترے اشک بے جزا تھے
جہاں تری قبر بے نشاں ہے
اسے یہ کہنا —— "سزا کی رت کے طویل دن میں
مراجعت کی دعا نہ مانگے

(ایک خط آشنا درختوں کے نام)

یہ کس کی لحد ہے؟ یہ کیسا تعویذ ہے؟ یہ کونسا صحرا ہے جہاں ساعتیں تشنہ لب ہیں، بے گناہی، بین، زنجیر در، لہو کا کند ہتھیار، بے نشاں قبر اور سزا کے طویل دن کس کی داستان کا حصہ ہیں؟ شاعر نے یہ منظر کہاں دیکھے تھے؟ اس کے لفظوں کے آئینوں نے انہیں کیسے سنبھال رکھا ہے؟ شاعر خاموش رہتا یا آنکھیں بند کر لیتا تو اہلِ بست و کشاد کی جانب سے اسے آئندہ پرفارمنس کے لئے "ی" پرائز ملتے۔ لیکن شاعر تو چیخ اٹھا ہے، میں نہیں مانتا کالے قانون کو! سخن مجنوں کو! اسے آزادیٔ اظہار سے محروم رکھنے کا ہر حربہ ناکام ہو گیا۔ اس نے کھل کر کہا:

سبز سجادوں پہ بیٹھی بیبیوں نے
جس قدر حرفِ عبادت یاد تھے
پوپھٹے تک انگلیوں پر گن لیے
اور دیکھا —— رحل کے نیچے لہو ہے
شیشۂ محفوظ کی مئی ہے سرخ
سطرِ مستحکم کے اندر بست و در باقی نہیں
یا الٰہی، مرگِ یوسف کی خبر سچی نہ ہو!

ان لفظوں میں کون سا تیور ہے جس نے ایک پتھر دل آمر کو بلبلانے پر مجبور کر دیا تھا! وہ جانتا تھا کہ انبوہ ہوا اسی کی وجہ سے تعزیہ بردوش ہے۔ روزنوں میں سر برہنہ مائیں منتوں کا اجر اور خوابوں کی زکوٰۃ مانگ رہی ہیں۔ شاعر تاریخی حقائق، سماجی اور سیاسی معاملات، فطرتی عناصر، شعوری وسعتوں، لاشعوری گہرائیوں کو باہمی طور پر یوں مربوط و مجتمع کرتا ہے کہ اس کی تخلیق نئے خواب میں ڈھل جاتی ہے۔ "آئینہ خانہ" کی ہر نظم اختر حسین جعفری کے نئے خواب کی نقیب ہے۔ ان کے خواب سہانے نہیں ہیں۔ ان میں آرائشی رنگوں کی تلاش بے سود ہے۔ شاعر کا ہر خواب کسی مسئلے کے خارزاروں میں سے طلوع ہو کر مصائب کے بے آب و گیاہ صحراؤں کی خبر لے کر آیا ہے یہاں ذات آشوب شہر آشوب معلوم ہوتا ہے اور شہر آشوب ذات آشوب: "آئینہ خانہ" کی نظمیں آشوب خیز اور آشوب آفریں ہیں:

ہوائے شام! حذر، موجِ خوں گزرتی ہے
غروبِ مہر! دعا، آگ ہے سفینوں میں

اختر حسین جعفری کے "خواب" ان کے شعور کے تابع ہیں۔ انہوں نے خود کو لاشعوری دلدلوں میں گم ہونے سے بچایا۔ یہ خواب کماج کے بطن سے نمودار ہو کر سوا نیزے کے سورج کی مانند سروں پہ آ دھمکتے ہیں۔ کرسٹوفر کاڈویل نے عام خوابوں اور شاعر کے خوابوں میں فرق یوں نمایاں

کیا ہے:

Dream is neither directed thinking nor directed feeling, but free ---

that is non - social - association.

Poetic irrationality bears this resemblance to dream, that its flow of images is explained by affective laws; but it is not free as in dream. Poetic feeling is directed feeling -- feeling controlled by the social ego. Poetic associations are social. (Illusion And Reality)

اختر حسین جعفری نے "سماجی انا" کے دائرے میں خواب دیکھے۔ وہ اس انا کے جبر سے مسحور نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی فکری اور احساساتی جہت کا آزاد چناؤ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عمر جلتے سہرا اور خنک مہتاب کے رنگ سمجھتے تارِ نظر کی گرہیں کھولتے اور ریشم بنتے کٹی ہے۔ انہوں نے اپنی سماجی حقیقت کے دھاگے سے اپنے نئے سماجی خوابوں کا ریشم تیار کیا ہے۔

"آئینہ خانہ" میں تین شاعروں کے حوالے سے تین فکر انگیز نظمیں شامل ہیں۔ "ایذرا پاؤنڈ کی موت پر" "رات کے آنسو تیری روشن آنکھوں میں" (احمد ندیم قاسمی کے لئے) "ابھی تو مہتاب گیان میں ہے" (مجید امجد کے حوالے سے)۔ تینوں نظمیں شاعر کے باطنی خوابوں کی اجمالی تصویر کشی پر مبنی ہیں۔ ان تینوں نظموں میں شاعر کا شاعری کے بارے میں نقطہ نظر کھل کر سامنے آیا ہے۔ ایذرا پاؤنڈ کی موت پر سوگوار لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ حقیقی شاعر کی اپنی شاعری یا لفظوں سے زیادہ دہر میں کوئی اور نوبہار نہیں ہوتی۔ کوئی نقاد یا کوئی مرثیہ نویس اسے اپنے خشک یا بنجر باغوں سے پھول عطا کرنے سے قاصر ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے فن اور شخصیت کے حوالے سے لکھی گئی مختصر نظم میں ان کے تخیل نے مستقبل کے منظر دیکھے ہیں۔ اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اختر حسین جعفری اچھے شاعر کو نا آفریدہ گلشن کا عندلیب سمجھتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ شب و روز اور زمان و مکان کے مشاہدوں اور معاملوں کو اس انداز سے احاطۂ نظم میں سمیٹے کہ آنے والی کل کے دامن میں شاعر کا عکس موجود رہے۔ شاعر جن منظروں کے بارے میں سوچتا ہے یا جن دکھوں سے مغموم و محزوں ہوتا ہے ان کو اس طور جامۂ شعر عطا کرتا ہے کہ وہ زمینوں، آسمانوں اور انسانوں کے لئے نئی بشارتوں کا قاصد بن جاتا ہے —— ایسا قاصد جو آئندہ نسلوں کے لئے قیمتی اثاثہ ٹھہرتا ہے۔ مجید امجد پر نظم لکھتے ہوئے اختر حسین جعفری نے کہا ہے کہ انہوں نے "آسمانِ معنی کے صحیفے" کے نادیدہ حرفوں کی اس زمین کو نوید سنائی تھی۔ شاعر سیاہ راتوں میں نطق کے پھولوں کو ہدایتوں سے نوازتا ہے۔ انہیں مجید امجد کی موت پر یوں محسوس ہوا تھا کہ کوئی کام ادھورا رہ گیا ہے وہ جسے سورج، چاند اور عکس چاہتے تھے وہ ان کے سامنے نہیں آ سکتے تھے۔ اختر حسین جعفری کی اپنی شاعری میں وہ قوت اور توانائی ہے کہ نقادوں کے بے جان لفظ اس کی تعین نہیں کر سکتے۔ اختر حسین جعفری نے بھی سہانے مستقبل کو دریدہ تخیل میں سمیٹنے کا جتن کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اشکوں، آہوں، دکھوں اور سلگاہٹوں کو نظم کا لباس عطا کرتے ہوئے اس امر کا خصوصی خیال رکھا ہے کہ ان کا تجزیہ اور جائزہ نئے سماجی قاعدوں اور نئے انسانی اور تہذیبی حوالوں کی بشارت بن کر ابھرے۔ اختر حسین جعفری نے اپنے اردگرد موجود دکھوں کی سیہ رات میں نطق کے پھولوں کو ہدایتیں دینے کا شاعرانہ فریضہ ادا کیا ہے۔

اختر حسین جعفری کو شاعرانہ ذمہ داری کے مفہوم سے مکمل آگاہی تھی۔

"نوکِ مژہ پر ہویدا اشک کو پسِ حجاب کلام کرنے کی تدریس اور برگِ گل پر متحیر شبنم کو ہزاروں سورجوں کی تمازتوں کے درمیان زندہ رہنے کی تعلیم میں کہاں تک پیش رفت ہوئی ہے!"

"پیوند لگی چادر کے کتنے نوحے رقم ہوئے ہیں اور کتنے تار و سنان ان لیلاؤں کے سپرد ہوئے ہیں جن پر دھواں چھوڑتی مل تک

پہنچنے کا رستہ خاردار تاروں کے جال نے روک رکھا ہے ؛ قومی تاریخ کے استحصالی مناظر میں قریب و بعید کے تہذیبی ورثوں کے آب و گل اور نئی پرانی شعری زبان کے رنگ و روغن سے جدید حسیاتی پس منظر میں ایجاد کردہ کون کون لعبتیں نمائش میں رکھی گئی ہیں ؟" ان سوالوں کا جواب "آئینہ خانے" کی شاعری اور شاعر نے فراہم کر دیا ہے۔ اشاریت، علامتیت اور رمزیت کے پیرایے میں جدید طرزِ احساس کی نَو نے کیا رنگ دکھایا ہے اس کے لیے "آئینہ خانے" میں "خلوت پیشِ آئینہ ہے" "سدھائے ہوئے پرندے" "آخری پیڑ کب گرے گا" "عکس اور فاصلے" "مقتل کی بازدید" "طلوع و غروب" اور "فیصلہ صبح کرے" کے عنوانوں سے چھپنے والی نظمیں ملاحظہ ہوں۔ اختر حسین جعفری کو فرد کے خالی پن سے لے کر سماج کی نابینا آنکھوں تک بے شمار تجربوں اور مشاہدوں سے سابقہ پڑا۔ یہ تجربے سوریلی انداز میں بھی بیان کیے گئے ہیں اور تمثالی، حسّی، تصوراتی، تلازماتی اور تاثراتی اطوار سے بھی :-

جب لمحے کا روزن کھولیں
کمرہ خالی آوازوں سے
کمرہ نابینا آنکھوں سے
فرش سے چھت تک بھر جاتا ہے
خلوت پیشِ آئینہ ہے

وہ ایک میٹھی صدا کی ندی
جو رات دن کی جلی زمینوں سے دُور سرسبز جنگلوں میں رواں ہے
نغمے بکھیرتی ہے
کوئی سدھایا ہوا پرندہ نہ اس کے سرسبز ساحلوں پر
اتر سکے گا !

ذہن کی قوس پر مضطرب موت نے آخر اختر حسین جعفری کو بھی آلیا۔ وہ راستے میں اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ انہیں تو اپنی عمر کے اور بہت سے پیڑوں کو کاٹنا تھا لیکن یہ اچانک آخری پیڑ کیوں کٹ گیا ؟ یہی وہ سوال ہے جو شاعروں، فلسفیوں اور صوفیوں کو مابعد الطبیعاتی حقائق کی کائنات میں لے جاتا ہے۔ اختر حسین جعفری کی نظموں میں زندگی، موت، تخلیقِ کائنات، ہستیِ خدا، عالمِ آخرت کے حوالوں سے یہ حقائق روشن ہوتے ہیں۔ شہود، غیب، زمین، آسمان، وجود اور عدم کے مسائل ان کے شعور کا حصہ تھے —— وحدت الوجود کا تصور (خواہ ابن العربی سے ماخوذ ہی کیوں نہ ہو) ان کے لیے اجنبی نہیں تھا :

رخِ بشر سے جو پردہ ہٹا تو جھولے میں
وہی تھا چہرہ جو صبحِ ازل کو دیکھا تھا (ہوا نے کھول دیے بھید)

اختر حسین جعفری کی نظموں میں جس لسانی رکھ رکھاؤ اور استعاراتی معنوی ربط کا اہتمام تھا وہ آج کے اکثر نظم گو شعرا کے ہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ آتش نے شاعری کو مرصع سازی کہا تھا۔ یہی کلاسیکی معیار جب جدید دَور کا کوئی شاعر اپنا لیتا ہے تو وہ خیالوں کے قافلوں کو ان کی حقیقی منزلوں سے ہمکنار کر جاتا ہے۔ اختر حسین جعفری کی شاعری فنی بالیدگی اور جمالیاتی آئینہ بندی کے اوصاف سے مالا مال ہے۔ ایک مصاحبے میں انہوں نے اپنے نظریۂ فن کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا :

"کوئی ادبی اظہار اپنے دائرۂ کار میں زندگی سے الگ نہیں ہوتا۔ یہ پھول زندگی کی شاخ پر کھلتا ہے اور اس پھول پر اس عصر کے تمام رنگ نمایاں ہوتے ہیں جن کی آب و ہوا میں اس پھول کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس پھول کی بیخ و بن میں اس عہد کے سماجی رویے محبتیں، نفرتیں، عقائد اور شکوک بطور سبب نمو موجود ہوتے ہیں، جب کہ اس کی شاخ کے ساختیاتی عمل میں اس عہد کی سماجیات و اخلاقیات ایک نظام کی صورت میں اسے زندہ و قائم رکھتی ہے۔ میں ادب کو حیات کی ارتقائی کلیت میں ایک اہم جزو سمجھتا ہوں جس کا بنیادی مقصد زندگی کو مزید ترقی یافتہ اور خوبصورت بنانے میں اپنا مخصوص کردار ادا کرتا ہے۔"

اختر حسین جعفری کی نظموں میں سوچتی سچائیاں اور تجزیاتی صداقتیں اس امر کی غماز ہیں کہ شاعر نے اپنے عہد کے مختلف فکری اور تحریکی رنگوں کا گہرا مشاہدہ کیا اور پھر ان میں سے چند رنگ اپنے لئے منتخب کر کے ان کی نئی آمیزشوں سے موثر لفظوں میں ان خیالوں کی تصویریں اجاگر کی ہیں جو عصری مسائل کا جوہر لئے ہوئے ہیں۔ اختر حسین جعفری کے تخلیقی نقطۂ نظر کی انکساری اور خلوص کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے اس باکمال رویے کو دیکھئے جو انہوں نے نوجوان نظم گو شعرا کے سلسلے میں اپنا رکھا تھا۔ انہیں ہر وہ نیا شاعر اپنا دوست محسوس ہوتا تھا جس کے کلام میں خیال کی تازگی، زبان کی جمالیاتی نہج اور جذبے کی ندرت کا ذرا بھی شائبہ ہوتا تھا۔ اعجاز رضوی، افتخار بخاری، جاوید انور، احمد لطیف اور منصورہ احمد کی نظمیں انہیں بہت پسند تھیں۔ نئی شاعری کی تحریک سے وابستہ نظم گو شعرا میں سے وہ ان کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے جو وزن، لفظوں کے شعری استعمال اور خیال کی تخیلاتی ترتیب و تشکیل میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔ اظہار کی قوت اور تازگی کے وہ خود بھی قائل تھے اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ اختر حسین جعفری کی موت سے کلاسیکی رکھ رکھاؤ کا حامل ایک جدید شاعر ہم سے بچھڑ گیا۔

لوحِ خاک

احمد ندیم قاسمی

کی

تازہ ترین نظموں غزلوں کا مجموعہ

نظر افروز گیٹ اپ کے ساتھ

قیمت -/۹۰ روپے

اساطیر- ۶/۳۹ ملک چیمبرز۔ لوئر مال۔ لاہور

یوسف حسن

خوں چکاں دلوں کا رفیق

اختر حسین جعفری کیلئے

واقعہ کوئی بھی عجیب نہیں
بُود و نابود کی کہانی میں
خاک پھر رزقِ خاک ٹھہری ہے

مگر اے خوں چکاں دلوں کے رفیق!
بود و نابود کی کہانی میں
ابھی تازہ نفس ہیں خواب ترے
ہم سفر ہے ترے خیال کی رو
ہم سخن ہیں ترے حروف کے چاند
کس قدر مہرباں رفاقت ہے

اور اس مہرباں رفاقت میں
خیمہ بردوش، رہروانِ وفا
اپنے امکاں تلاش کرتے ہیں

اعتبار ساجد

اختر حسین جعفری کی یاد میں

کلیوں کا خواب، پھول کی تعبیر تھا وہ شخص
رنگِ رُخِ بہار کی تفسیر تھا وہ شخص
تھیں اس کی سلطنت کی حدیں ذہن و قلب تک
دنیائے شعر و فن کا جہاں گیر تھا وہ شخص
شاداب خال و خد بھی اُسی کے قلم سے تھے
کچھ سوختہ دلوں پہ بھی تحریر تھا وہ شخص
پھرتی تھی اُس کی رُوح دلوں میں کھنڈر، کھنڈر
وقفِ صعوبت و غمِ تعمیر تھا وہ شخص
اس کے طلسمِ حرف میں ہم سب اسیر تھے
بیڑی وفا کی، پیار کی زنجیر تھا وہ شخص
روشن تھیں اس کے نور سے ذہنوں کی کھڑکیاں
اس عہدِ بے چراغ میں تنویر تھا وہ شخص
زینت ترے وجود کی تھی اس فریم سے
دیوارِ نظم! قیمتی تصویر تھا وہ شخص
اس بام، اس فراز کے لائق تھا اس کا نام
اس اوج، اس مقام کی توقیر تھا وہ شخص

مسرت ہاشمی

اختر حسین جعفری

وہ پربت پار سے آیا زبوں حالی کے موسم میں
جہاں صحرائی نغموں کی جوانی مرنے والی تھی
مجھے معلوم تھا ——
ابرِ کرم کے ہر ٹھکانے پر اُسے نقاش لمحوں نے سخنور لکھ دیا ہوگا
وہ کشتی سے اُتر کر بھی مسافت کا سمندر تھا
کہ سارے ابر پارے اس کی مدحت میں یگانہ تھے
اُسے معلوم تھا —— دل کے جزیرے پر اُترنا ہے
ہوائیں سُرخرو ہونے کی خاطر لہلہاتی تھیں
مجھے برسات کے موسم کا ہر نغمہ سُناتی تھیں
مگر اِس بار —— اُسے میں نے کئی آنکھوں،
کئی قرنوں کے آنسو بھی رُلانے تھے
کئی آبی پرندے چہچہانے تھے
مرے فردوس میں اُس کی بصارت گنگناتی ہے
ہمیشہ جگمگاتی ہے
کہ سارے ابر پارے اُس کی مدحت میں یگانہ ہیں

مسرت ہاشمی

اختر حسین جعفری

دیارِ عبرت میں آج پہلی اذاں سے پہلے
سحر کی آغوش میں ستاروں کی سسکیاں ہیں
افق، ردائے کفن بریدہ کہ خوں چکیدہ
سیاہ حرفوں کی تعزیت ہے
کسی کی خاطر
شعور لمحوں کے راستے پر
ہزار سورج جلانے والا
سفر کا اعلان کر چکا ہے
زمیں پہ لکھی ہوئی عبارت پکارتی ہے
ہوا میں آنسو اُمڈ پڑے ہیں
فلک پہ ہجرت نواز مہتاب جھومتا ہے

پروفیسر محمد افضل

ہر ایک تنہا سفر کڑا ہے

اختر حسین جعفری کی نذر

ہر ایک تنہا سفر کڑا ہے
تمام خلقت کا
عمر بھر تک
ہر ایک تنہا سفر کڑا ہے
کہیں کا بھی ہو، کدھر کا بھی ہو
بس ایک ہی پل
کا فاصلہ ہے
اِس ایک گھر سے
اُس ایک گھر تک

عجب جہاں ہے
نگارخانہ ہے پیش و پس بھی
عجیب دنیا
ہے گویا زندانِ ہر نفس بھی
کہ سب اکیلے رواں ہوتے ہیں
کسی نگر سے کسی نگر تک

ہر ایک تنہا سفر کڑا ہے
کہیں کا بھی ہو، کدھر کا بھی ہو
جو چل پڑے ہو
تو موسموں کا خیال رکھنا!
عجب ہوا چل پڑی ہے لوگو
چراغ اپنے سنبھال رکھنا!

دل نواز دل

دُعائیں

اختر حسین جعفری کے کلام کی روشنی میں

ساقیٔ ہستی کے مے خانے کی خیر
عکسِ جاں کے آئنہ خانے کی خیر

تجھ پہ رحمت اے شبِ اختر شمار
شمع کے ہر ایک پروانے کی خیر

خیر اُس دل کی رہا جو بے نیاز
شہرتِ دُنیا سے بیگانے کی خیر

درد کے ساغر میں بھر صبرِ جمیل
مالکِ مے! تیرے پیمانے کی خیر

خواب، جنگل، رنگ، خوشبو، کوہسار
دل دھنک صحرا میں دیوانے کی خیر

اختر حسین جعفری اور "روپہلی سطر کا وعدہ"

ڈاکٹر نوازش علی

اختر حسین جعفری نے کوئی زیادہ شعری سرمایہ نہیں چھوڑا۔ ان کے پہلے شعری مجموعے "آئینہ خانہ" میں کل ترپن (۵۳) نظمیں ہیں۔ جن میں ایک طویل نظم "آئینہ خانہ" جو کتاب کا عنوان بنی ہے۔ پچیس (۲۵) ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ جعفری صاحب نے اسے ایک نظم کے طور پر کتاب میں شامل کیا ہے۔ یوسف حسن صاحب کی عنایت سے مجھے مزید پندرہ (۱۵) نظمیں ملی ہیں۔ جن میں سے "سخن درماندہ ہے"، "فردا" نمبر ایک[1] میں شائع ہوئی۔ اُسے بھی کسی حد تک طویل نظم کہا جا سکتا ہے۔ یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح ان کی جو نظمیں میری دسترس میں ہیں ان کی تعداد اڑسٹھ (۶۸) بنتی ہے۔ جو کہ مقدار کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہیں۔ اگرچہ انہوں نے مزید بہت سی نظمیں بھی لکھی ہوں گی[2] تاہم ان کے شعری سفر کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بہت زیادہ نہیں لکھا یا وہ بہت زیادہ انتخاب پسند واقع ہوئے تھے اور اپنے مخصوص مزاج سے ہٹ کر لکھنے کی طرف مائل نہ ہوتے تھے۔ اس اختصار کے باوجود اختر حسین جعفری کی شاعری میں روپہلی یا اُجلی سطر لکھنے کا وعدہ کئی ایک رنگوں، زاویوں اور شکلوں میں صاف گونجتا سنائی دیتا ہے۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ روپہلی یا اُجلی سطر سے مراد شعری سطر ہے۔ اجلی شعری سطر لکھنے سے متعلق جتنے لفظی متعلقات و تلازمات کا ذکر ان کی شاعری میں ملتا ہے، شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں دکھائی دے۔ ایک نظر ان پر بھی ڈالتے چلیے تاکہ میں اپنی بات آسانی سے کہہ سکوں۔ نقطہ، حرف، لفظ، سطر، کتاب، کلام، انگلی، قلم، دستِ ہنر، نطق، لوح، بات، ورق، تحریر، قرطاس، قط، نظم، واقعہ، کہانی، دستخط، عبارت، کاغذ، بیان، لغت، گنتی، مفہوم، ہاتھ، قصہ، معانی، صحیفہ، جملے، اظہار، شقیں، اعراب، آیت، سخن، فقرہ، رجز، مضمون، خواندگی، سخن سازی، روپہلی سطر، خفی احوال، زرِ معنی، جوہرِ صورت، روشنائی وغیرہ الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں وہ الفاظ شامل نہیں ہیں جن کا تعلق صوت و صدا کے ساتھ ہے۔ اگرچہ ان کا استعمال بھی بکثرت ملتا ہے۔ ان کی کچھ نظموں سے چند ایک ٹکڑے دیکھیے جن میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اور روپہلی سطر لکھنے کی خواہش کے اشارے کئے گئے ہیں:

اُٹھائیں فرشِ سماعت سے لفظ لفظ کی خشت
صدا کے خشک سمندر کو چھان کر دیکھیں
کہاں ہے جوہرِ صورت، کہاں زرِ معنی
جگائیں حرف کو خوابِ سفر سے اور پوچھیں

---

[1] یہ نظم "فردا" سے پہلے فنون نمبر میں شائع ہو چکی تھی (ادارہ)

[2] "آئینہ خانہ" کے بعد "فنون" کی قریب قریب ہر اشاعت میں مرحوم کی تازہ نظم شائع ہوتی رہی ہے (ادارہ)

کہاں وہ قصر ہے جس کے کھلے دریچے سے
دکھائی دیتا ہے مفہوم کا نیا چہرہ
وہ روشنائی، وہ خوشبوئے غم کشید کریں
مشامِ جاں نے جو قرطاس پر نہیں دیکھی

بتائے کون کہ کاغذ کی سطحِ خالی پر
بغیر حرف بھی نقطہ وجود رکھتا ہے
وہ قتل گاہ کہاں ہے جہاں پہ لفظوں نے
فراقِ حسنِ تمنا میں خودکشی کر لی
سپیدۂ سحری میں گھلی ہوئی ظلمت
بدن کی لوح پہ اتری تو سطر سطر ہوئی

(آئینہ خانہ)

تیرا نام وہ حرف جسے امکان کی لوح پہ دیکھ کے میں نے
پیش و پس سے نقطہ نقطہ جوڑ لیا ہے
اسموں والے! حرفوں والے! ناموں والے!
مجھ کو بھی اک نام عطا کر
میری جھولی مدحت کرتی بوندوں، کرنوں، چمکیلے حرفوں
سے بھر دے

(اک انعام کے کتنے نام ہیں)

شام ڈھلے تو
زلف کھلے تو لفظو! ان رستوں پر جگنو بن کر اڑنا
راہ دکھانا
دن نکلے تو تازہ دھوپ کی چمکیلی پوشاک پہن کر
میرے ساتھ گلی کوچوں میں
لفظو! منزل منزل چلنا

(نظم)

ہوا نے میلی زمیں سے اپنے
وہ فرش خالی کرا لیے ہیں کہ جن کے اوپر صدی صدی کے
لکھے ہوئے کاغذوں کے پرزے پڑے ہوئے تھے

(نئے دوستوں کا استقبال)

اس کے بعد قلم مجبور ہے ۔ انگلی شل ہے
دیکھو، پچھلی گلی میں کن فیکی اصنام کی بھیڑ ہے، ہر حرف کا تارا
کس تازہ شکر کی چاپ سے بے کل ہے

(خواب کہاں رہتے ہیں)

تبر کی ضربتِ کاری سے، شاخوں سے زمیں پر
پتا پتا حرف گرتے ہیں
مہکتا ہے کہیں صیاد کے فتراک میں نافہ
مرے محبوب کا وعدہ
اسی تشنہ ستارے کے تعاقب میں سخن اپنا فلک مہتاب و انجم کے
سفینوں سے بھرا دریا گنوا بیٹھا
مسافت سطر سے تا سطر کس سورج پہ طے ہوگی
کوئی ٹکڑا فلک کا ہاتھ آئے تو رجز لکھیں

. . . . .

سخن سازی، ورق سازی
گھلے احساس کی چاندی، مسلسل ضربتِ دل اور روپہلی سطر کا وعدہ

. . . . .

بدن صدیوں سے کاہش میں بندھے ہیں
رسیاں کھولو
یہ ہاتھ آزاد ہو کر اپنے حصے کا ورق آباد کریں گے

. . . . .

اُسے اس کی بصارت دو
خفی احوال کہنے دو
کہ اجلی سطر کا وعدہ
اسی سے اس کا وعدہ ہے

(سخن درماندہ ہے)

مثالوں کی طوالت کے لیے معذرت خواہ ہوں، اگرچہ ابھی بیسیوں مصرعے مزید درج کئے جا سکتے ہیں جن میں سخن سازی سے متعلق الفاظ و تراکیب استعمال کئے گئے ہیں۔ کسی ایک شاعر کی نظموں میں، جس نے کچھ زیادہ کلام بھی نہ چھوڑا ہو، سطر سازی کے بارے میں اتنے زیادہ فنی اور نفسی متعلقات کا جمع ہو جانا بے معنی بات نہیں ہے۔ فنی اعتبار سے سخن سازی سے متعلق الفاظ کا تخلیقی استعمال ذہن کو اس راستے پر

ڈالتا ہے کہ ان کی شاعری فنی حسن کاری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ وہ ایک روپہلی اور اُجلی سطر لکھنا چاہتے ہیں۔ اس قدر پختہ سطر بندی کا فن شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو نصیب ہوا ہو۔ کسی بھی مصرع میں کوئی زائد حرف نہیں تلاش کیا جا سکتا۔ اسی لیے ان کے مصرعوں میں کہیں کوئی جھول محسوس نہیں ہوتا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ ان کے موضوعات ان کی فنی بنت کاری میں یوں پیوست ہو گئے ہیں کہ بعض اوقات موضوع کی دریافت بذاتِ خود ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ نظم اپنی وحدت و کلیت میں اور ہر سطر انفرادی سطح پر دل و ذہن کو گرفت میں لے لیتی ہے اور موضوع کی دریافت یا جستجو ایک بے معنی سی بات معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک اُجلی اور پُراثر سطر کے کیف میں قاری کو بھگو دینا ہی ان کی شاعری کا بنیادی وظیفہ معلوم ہوتا ہے۔ سطر مستحکم لکھنے کی خواہش، صادق لفظوں کی سرگوشی سننے کی لگن، جوہرِ صورت اور زرِ معنی کی تلاش، حرف کو خوابِ سفر سے جگانے کی کاوش، مفہوم کا نیا چہرہ دیکھنے کی تمنا، چمکیلے حرفوں سے جھولی بھر لینے کی دعا، لفظوں سے رستوں پر جگنو بن کر اُڑنے اور منزل منزل ساتھ نباہنے کی التجا، حرف کو رہبر تارا بنانا، دفینوں میں زرِ حرف کی تلاش، مسلسل ضربتِ دل اور روپہلی اور اجلی سطر لکھنے کا وعدہ وفا کرنے کا عزم —— یہ ساری باتیں ان کی شاعری کے مرکزی کردار کو واضح کر دیتی ہیں۔

فنی حسن کاری سے ان کی دلبستگی اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے چار مختلف شعراء پر نظمیں تخلیق کی ہیں یعنی ایذرا پاؤنڈ، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد اور فیض احمد فیض۔ ان چاروں شعراء کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بھی سطر سازی کے فنی اور لفظی متعلقات کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ان نظموں کے چند ٹکڑے دیکھئے:

آ تجھے تیرے سبز لفظوں میں
دفن کر دیں کہ تیرے فن جیسی
دہر میں کوئی نو بہار نہیں
—— (ایذرا پاؤنڈ کی موت پر)

تُو افلاک میں موج موج سرکتے تاروں، قلزم قلزم پار اترتے
ملاحوں کی فتح کا نغمہ
اس نغمے کی ناؤ جب کل کے ساحل پر ٹھہرے گی
بچے شور کریں گے — دیکھو!
دور دیس سے نئے کھلونے، ہیرے موتی
رنگ برنگے کاغذ کے تھیلوں میں بھر کر آتے ہیں
جن پر کوئی محافظ، پہرے دار نہیں ہے
—— (رات کے آنسو تیری روشن آنکھوں میں)
(احمد ندیم قاسمی کے لئے)

ابھی تو اترا نہیں کسی آسمانِ معنی سے وہ صحیفہ
کہ جس کے نادیدہ حرف کی تم نے اس زمیں کو
نوید دی تھی
ابھی سرِ شاخِ نطق ہر پھول منتظر ہے ہدایتوں کا

ابھی نہ جاؤ
سیاہ راتوں میں اس سفر پر مجید امجد
ابھی نہ جاؤ

(ابھی تو مہتاب گیان میں ہے)

وہ جو پیش و پس میں تھی روشنی
سرِ سطرِ شوق رہی نہیں

. . . . .

ابھی درسِ مکتبِ حسن و ہجر تھے کم مرے
ابھی اس حرم کے طواف میں تھے قدم مرے
تجھے کیوں ہو دعوۂ ہمسری کہ بہت فرو تھے علم مرے ابھی اس کے منبر و بام سے
زرِ صبح اس کا گراں بہت مرے عنبرِ شبِ خام سے
یہ عجیب قحطِ صدا پڑا مرے شہر میں سرِ شام سے

(نوحہ)

(فیض احمد فیض کے لئے)

اپنے عہد کے بڑے فنکاروں بلکہ عہد ساز فنکاروں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یا پھر ان کے بچھڑنے پر اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے وہ بنیادی توجہ اور زور ان شعراء کی فنی کاوشوں پر دیتے ہیں اور شعری سطر کے متعلقات ہی کو زیادہ تر استعمال کرتے ہیں جیسے لفظ، فن، نقد، کاغذ، آسمانِ معنی، صحیفہ، نادیدہ حرف، سرِ شاخِ نطق، سرِ سطرِ شوق، لحن اور صدا وغیرہ کے الفاظ فراوانی سے استعمال کئے گئے ہیں جو ان کے اصلی سطر لکھنے کے وعدہ کی تکمیل کی طرف ذہن کو منتقل کر دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ایک مسئلہ یہ بھی سر اٹھاتا ہے کہ اصلی سطر لکھنے پر بہت زیادہ توجہ اور فنی مہارت صرف کرنے کی وجہ سے کہیں جذبہ، کہیں احساس اور کہیں خیال سطر کے اندر اس طرح پیوست نہیں ہو سکا کہ الگ سے احساس یا خیال پر کوئی بات کی جا سکے۔

اگرچہ یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ اختر حسین جعفری کی شاعری موضوعات کے پھیلاؤ اور تنوع سے ذرا دامن بچاتے ہوئے ہے لیکن ان کی تازہ کاری، اسلوب کی انفرادیت اور پختگی، فنی بنت کاری، حشو و زوائد سے قطعی پاک مصرعے، نئے نئے خوش آہنگ اور متحرک استعارے اور خوش وضع اور بامعنی علامتیں ذہن کو ان کے موضوعات کی تنگ دامانی کی طرف منتقل نہیں ہونے دیتیں، گویا ان کے ہاں سارا شعری سفر علامتوں کے آئینہ خانوں کی کثرت کے ہمراہ آگے بڑھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اگرچہ اختر حسین جعفری کے بارے میں انتہائی بلیغ رائے ظاہر کی ہے لیکن ان کی رائے کو مکمل اور حتمی طور پر قبول کرنا قدرے مشکل امر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

> اختر حسین جعفری کی شاعری، علامت کے لطیف، موثر اور غیر مبہم استعمال کی ایک ایسی مثال ہے جس کی نظیر کم سے کم جدید و قدیم اردو شاعری میں تو سرے سے ناپید ہے ..... اردو میں اختر حسین جعفری کی علامتی شاعری اس لیے منفرد مرتبہ رکھتی ہے کہ اس کی علامت حقیقت اور صداقت کی صحیح تفہیم میں قاری کی مددگار

ثابت ہوتی ہے اور جب علامت قاری کے دل و دماغ کی پرتیں کھول رہی ہو تو وہ مبہم نہیں رہتی اور یوں وہ جذبے، خیال اور احساس کی ترسیل میں، براہِ راست اظہار کے مقابلے میں، کہیں زیادہ دیرپا اثرات مرتب کرتی ہے۔"

اختر حسین جعفری کے ہاں علامت کا لطیف اور مؤثر استعمال تو ملتا ہے لیکن یہ بات ہر جگہ موجود نہیں ہے۔ بعض مقامات پر علامت در علامت کے استعمال کی وجہ سے شعری تفہیم کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور خیال و احساس کی ترسیل کا فریضہ کماحقہٗ ادا نہیں ہو پاتا۔ البتہ اکثر علامات ہمارے تہذیبی سفر اور تہذیبی عقائد و نظریات سے کشید کی گئی ہیں اور انہیں نئے معنوی امکانات کی ترسیل کے لیے برتا گیا ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی قاری نئے معنوی امکان تک پہنچنے کی کاوش کے باوجود نہیں پہنچ پاتا۔ اس کے باوجود یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان کی بعض تہذیبی عقائد کے بطن سے پھوٹی ہوئی علامات اگر ہر جگہ نہیں تو کہیں کہیں ضرور عالمگیریت اور آفاقیت کا احساس دلاتی ہیں۔ چنانچہ کئی ایک مقامات پر وہ علامت کو ہمارے تہذیبی سفر کی صدیوں پر پھیلا دینے کے ہنر سے واقفیت کا ثبوت فراہم کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اسلامی تہذیب و تاریخ سے کشید کی گئی چند ایک بہت بامعنی علامات جن کو نئے معنوی امکانات سے انہوں نے روشناس کرایا، وہ کربلا سے متعلق ہیں۔ شہادتِ امام حسین کے چھینٹے کربلا کی خاک سے عہدِ حاضر کے صحرا تک آن پہنچے ہیں۔ تاریخی سانحات کے تسلسل سے انہوں نے کئی ایک انتہائی بلیغ علامات اخذ کی ہیں۔ ان کی شاعری اکثر و بیشتر انہیں علامات کے گرد گھومتی ہے۔ جہاں سے وہ جرأت و استقامت اور حریت لگر بھی حاصل کرتے ہیں اور عہدِ حاضر کے فریبوں اور ظلم و ستم کا پردہ بھی چاک کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری کو عہدِ حاضر کا کربلائی اظہار بھی کہا جا سکتا ہے۔ تاہم ان کی شاعری کی عمومی فضا ماتم گزیدہ نہیں ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ غم انگیز فضا کہا جا سکتا ہے۔ وہ آج کے کربلا میں آج کے حسین کو بھی تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ تازہ صف بندیوں کا موسم محسوس کرتے ہیں ایسے میں خون میں ڈوبا ہوا آج کے حسین کا چہرہ اور اس کا پرچم ڈھونڈنے کی لگن اختر حسین جعفری سے غم آمیز لیکن پُرقوت نظمیں لکھواتی ہے۔ گویا ان کے ہاں کربلائی مناظر اور کربلا سے متعلق جذبے نئے معنوی امکانات دریافت کر لینے کے تحیر سے گزرتے ہیں۔ یہی صورتِ حال ان کی طویل نظم "آئینہ خانہ" میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اختر حسین جعفری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بعض تاریخی واقعات کو علامتی سطح عطا کی ہے۔ اس طویل نظم میں شاعر کے ذہن کی خواب گاہوں میں شہادتِ امام حسین اور واقعاتِ کربلا اور عہدِ حاضر کے ایک نہایت معروف سیاسی و عدالتی واقعے اور فیصلے کی پرچھائیاں بیک وقت ایک دوسرے میں مدغم ہوتی، پھر جدا ہوتی اور پھر ایک دوسرے میں پیوست ہوتی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس طویل نظم کے ان مصرعوں پر غور کیجیے تو بات واضح ہو جائے گی:

بتا کہ کون سے بازو پہ ہے رسن کا نشاں
بجھی ہے کون سی نوکِ مژہ پہ ابر کی راکھ
وہ کیسے خط ہیں جنہیں تُو دکھا نہیں سکتی

پیام جتنے صبا نے دیے، غلط نکلے
کہا جو موجۂ آبِ رواں نے، جھوٹ کہا
سفر کا رنج وہی، زیرِ پا زمین وہی
وہ پھول حلقۂ دامِ ہوا سے آگے ہے
سُنا گئی تھی ہوا کس وصال کی باتیں

دکھا رہی ہے زمیں کس فراق کا چہرہ

سفر کی رات تعاقب میں ہے سگِ مامور
نشانِ پائے سراغِ بدن لگائے گا
مدد کرے گا عدو کی ۔ نکل کے ابر سے چاند
دکھائے گا کہ سبھی بست و بود کی راہیں

نشیبِ درد میں اتروں تو قتل گاہ کی خاک
شکستہ خول، کھلی بکتریں، جلے ہتھیار
کچھ اس طرح سے مجھے گھیر لیں کہ میں جیسے
بقا کی جنگ کا ہارا ہوا سپاہی ہوں

خود اپنی ذات کی تردید کے شواہد بھی
مرے خلاف صف آراء مرے خلاف گواہ

پھر اہلِ شہر نے دیکھا کہ میں غنیم نہ تھا
پھر اہلِ شہر نے دیکھا کہ میرے چہرے پر
اسی ہراس، اسی خوف کا پسینہ تھا

فقیہہِ شہر نے دیکھا ہے روئے قاتل میں
جلی زمین کا چہرہ، شکستہ شاخ کا زخم
کنارِ آبِ تعفن کا ڈھیر جس کے قریب
زباں گرفتہ زنِ پیر اور سگِ تشنہ!

فقیہہِ شہر نے دیکھا ہے چشمِ قاتل میں
وہ زہر جس کے تعقب سے گل رہے ہیں بدن

زبانِ تشنہ نہ رکھ آبِ شور پر کہ مری
خمیدہ پشت پہ رکھا ہے اب بھی مشکیزہ

قریب آ کہ وہ مسند تجھے دکھاؤں میں
کہ جس کے گرد شبِ حیلہ جُو کی زرد، پسہ
مجھی سے میرے لہو کا حساب مانگتی ہے
سگانِ شام کہاں حبسِ ناروا میں رہے
خلاف کس کے ہے صبحِ عناد کا دعویٰ
ذرا ٹھہر کہ دمِ فیصلہ سوال بہت
جلا وطن سے شبِ ناسپاس پوچھے گی

وہ چُن رہا تھا رسن، سوختہ سفال چراغ
جلا جو خیمۂ ابرِ بہار اس کا تھا
سمٹ رہا تھا وہ موتی سا اندرونِ صدف
کہ بُزدلوں کے تصرّف میں بحر و بر آئے

سوالِ عدل تھا یا احتجاج تھا، کیا تھا
ہجومِ عام سے تھا موردِ ناتواں کا خطاب
کتاب کھولتا تھا، اندمال لکھتا تھا
پڑا تھا خشک لہو کا اناج منبر پر

اسی کے نام کڑی دوپہر میں جلتے بدن
اسی کی نذر تجھے حوصلوں کی مزدوری
اسی کی نذر قلم، حاشیے، سیاق و سباق
وہ جس کے ذکر سے خالی بھرا ہوا اخبار
اسی کے نام یہ تعویذِ نافرستادہ
جسے لحد میں اترتے ہوئے نہیں دیکھا

سرِ نگاہ وہی عکسِ آئینہ خانہ
وہی ہجومِ مقیّد، وہی خطِ پرکار
وہی پناہ کا جنگل، وہی سگِ مامور

اس نظم کا نام " آئینہ خانہ " اس کی تفہیم میں کسی حد تک معاونت کرتا ہے۔ اس عنوان سے بالکل سامنے کا تصور یہ ابھرتا ہے کہ آئینوں کا ایک گھر ہے جس میں پیش منظر اور زیرِ نظر حقیقت تو ایک ہی ہے لیکن آئینہ خانہ میں اس کی سیکڑوں شکلیں نظر آتی ہیں۔ حقیقت زیرِ نظر کا ہر زاویہ اور ہر منظر آئینہ خانہ میں ہر پہلو سے دکھائی دے رہا ہے۔ آئینہ خانہ کی وجہ سے تمام زاویے دکھائی تو تمام پہلوؤں سے دے رہے ہیں لیکن تمام مناظر اور تمام زاویے مل کر کسی ایک کلی وحدت میں نہیں ڈھل رہے اگرچہ زیرِ نظر حقیقت اپنی جگہ ایک اکائی کی صورت میں موجود ہے گویا ایک کلی حقیقت کے سیکڑوں مناظر نظروں کے سامنے سے گزرتے جا رہے ہیں۔ مناظر کی کثرت کی وجہ سے اس نظم کو ایک کلیت کی شکل میں دیکھا ہی نہیں جانا چاہیے۔ کیونکہ اس نظم میں حقیقت کے مقابل بیسیوں آئینے پڑے ہوتے ہیں۔ البتہ ایک دوسرے رُخ سے دیکھیں تو یہ نظم ایک کُل کی حیثیت بھی رکھتی ہے کہ آئینوں سے جو حقیقت بیسیوں شکلوں میں جھلک رہی ہے، وہ ایک ہے۔

" آئینہ خانہ " کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس نظم میں شاعر کسی ایک مخصوص موضوع کا اسیر نہیں ہے۔ دنیا ایک آئینہ خانہ ہے اور شاعر کے ذہن پر تہذیبی تاریخ اور عہدِ حاضر کے کئی ایک سیاسی واقعات کی کوکھ سے ابھرتے ہوئے کئی ایک موضوعات بیک وقت یلغار کر رہے ہیں وہ ان سب موضوعات کو ایک ہی نظم میں گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا اس نظم میں شاعر کا تخلیقی ذہن سیدھے سادے طریقے پر عمل نہیں کر رہا بلکہ یوں کہیے کہ یہ نظم شاعر کے پیچ در پیچ اور تہہ در تہہ شعور کی کرشمہ سازی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ یا اپنی سہولت کی خاطر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظم حضرتِ امام حسینؑ کی شہادت اور واقعاتِ کربلا اور تہذیبی تاریخ کے آئینہ خانہ میں کئی رنگوں اور پہلوؤں سے منعکس ہوتے ہوئے عصری سانحات کے پس منظر میں جدید ذہن و شعور میں لہریں لیتی ہوئی تبدیلیوں کی تمناؤں اور آرزوؤں کا شعری اظہار ہے۔

اختر حسین جعفری کی شاعری میں اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ انتہائی شعریت میں ڈوبا ہوا مصرع خلق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ان کے ہاں اتنی شدت اختیار کر جاتی ہے کہ سطر سازی اور فنی حسن کاری ہی ان کا مقصودِ فن معلوم ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ فن کی پرستش کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں کسی واضح نظریۂ حیات کی نشاندہی کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ وہ فکری سطح پر کسی غیر واضح نظریۂ حیات کے اسیر تھے۔ اسی لیے ان کی نظموں کی تفہیم میں بھی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی نظم "پہچان کی ابتدا" کی یہ لائنیں دیکھیے:

سمتوں کا نہیں اصول کوئی
بے رُشد قدم ٹھہر گئے ہیں
ہیں منزلِ جاں کے اس سفر میں
اس صدق کی طرح بے سہارا
پہچان کی بھیک کے لیے جو
ہر عہد میں در بدر پھرا ہے

کسی واضح اور دو ٹوک نظریۂ حیات کی عدم موجودگی کے باوجود اختر حسین جعفری خیر کی قوتوں سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں اور یہی ان کا نظریۂ فن اور نظریۂ حیات ہے۔ لیکن آج کے عہد کی مصیبت یہ ہے کہ ہر مکتبۂ فکر کے لوگ خود کو خیر کی قوتوں کے ہمراہی خیال کرتے ہیں۔ اس بات کا احساس اختر حسین جعفری کو بھی تھا۔ اسی لیے تو وہ کہہ گئے ہیں:

صداقتوں کے مقابل صداقتیں ہوں گی

اس مخصوص پہلو سے دیکھا جائے تو ان کا فنی طریقۂ کار اور طریقِ فکر معروف ترقی پسند شعراء سے مختلف نظر آئے گا۔ وہ

ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی اپنے فنی لوازم کے باعث معروف معانی میں ترقی پسند شعراء سے الگ بلکہ بعض مقامات پر بلند کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے فنی لوازم کو سہولت سے یوں بیان کیا جاسکتا ہے، اگرچہ یہ بات پورے طور پر درست نہ ہوگی، کہ الفاظ و تراکیب کی فارسیت کے حوالے سے انہیں اگر کسی جدید شاعر کے قریب کہا جاسکتا ہے تو وہ ن م راشد ہیں۔ البتہ ان کی علامات نہ صرف منفرد ہیں بلکہ متحرک بھی ہیں اور ایک جہانِ معنی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ سطر بندی اور فنی حسن کاری کے سلسلہ میں وہ مجید امجد کی شاعری کے درمیانی دور سے کسی حد تک متاثر نظر آتے ہیں، خاص کر "اداس کمہار کے نوحے" نامی نظم میں مجید امجد کے اثرات زیادہ گہرائی میں جاکر پڑے ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں تکنیکی اعتبار سے جدید مغربی شاعری کی تکنیکی مہارتوں سے بھی اثرات قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان اثرات کے باوجود ان کا فنی طریقۂ کار یا طرزِ اظہار یا اسلوب خالصتاً ان کا اپنا زائیدہ ہے۔ اگرچہ وہ اُردو کی شعری اور تہذیبی روایت سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں لیکن تکنیکی اعتبار سے وہ قطعی منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ ایک سطح پر روایت سے جڑے ہوئے ہونا اور ایک دوسری سطح پر بالکل منفرد دکھائی دینا ایک مشکل راستے کا انتخاب ہے۔ اختر حسین جعفری کا سا شعری سفر اس مشکل انتخاب کی داستان سناتا ہے۔

مشکل، منفرد اور منتخب راستوں سے شعری اور فنی خوراک حاصل کرنے کے باوجود ان کی شاعری پر جبر کے پہلو سایہ کئے ہوئے ہیں، لیکن یہ جبر محض حال کے لمحے کا نہیں ہے۔ اختر حسین جعفری نے تاریخی جبر کو بھی شاعری بنا دیا ہے۔ شاعر محسوس کرتا ہے کہ زندان کے پھاٹک چلتے چلتے ہر گھر کے دروازے تک آپہنچے ہیں جس کے نتیجے میں فراق وصال نئی کشمکشوں کی داستان بن گئے ہیں۔ اقدار کی شکست و ریخت کی وجہ سے ہوا تو وصال کی باتیں کرتی ہے لیکن زمین مسلسل فراق کا چہرہ دکھائی دیتی ہے، ہجر اور فاصلہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ محض ایک فصیلِ ذات ہے جس سے محکم کوئی فصیل نہیں، تاہم خمیدہ پشت پر اب بھی شکیزہ رکھا ہوا ہے۔ دو نیم جسم کو نمو کی خاک ارادے کی سبز ٹہنی سے ایک بار پھر جوڑ دے گی۔ رابطوں کے تاگے میں یہی ایک گرہ بچی ہے جس سے بات آگے چلے گی۔ اگرچہ نوائے خود گرفتہ سے سرودِ اجتماعی تک راستہ بہت دشوار ہوتا ہے —— لیکن یہیں سے وصال کی امید ہاتھ لگتی ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں شاعر اپنے محبوب سے کیا ہوا روپہلی سفر کا وعدہ نباہتا ہے۔

حکومت پاکستان ایکسپورٹ پروموشن بیورو

ایکسپورٹ پروموشن بیورو، حکومت پاکستان، ملتان یکم جون ۱۹۹۲ء سے درج ذیل پتہ پر واقع اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو جائے گا۔

ایکسپورٹ پروموشن بیورو حکومت پاکستان
۷۶۔ اے، نصرت روڈ ملتان چھاؤنی

نئی کمارت کنٹونمنٹ بورڈ آفس اور ہائی کورٹ بلڈنگ ملتان چھاؤنی سے متصل ہے۔
ٹیلی فون نمبر ۲۰۰۰۵، فیکس ۴۴۲۱۲ اور ٹیلکس نمبر ۴۲۲۷۴ ایکسن پام پی کے وہی رہیں گے۔
پی آئی ڈی (ایل) ۵۴۰۴-۵۴۲۴-سی۔ (یہ اشتہار تمام بڑے روزناموں میں یکم جون ۹۲ء کو شائع ہو چکا ہے)

(وحید رضا بھٹی) ڈپٹی ڈائریکٹر

سخن درماندہ ہے

منصورہ احمد

تین جون ۱۹۹۲ء کی شام سے میں مسلسل ایک بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں۔ لاکھ ہٹانے پر بھی وہ خواب میری آنکھوں سے نہیں ہٹتا۔ سوچ کے سارے زاویے بے محور ہو کر اُلٹے لٹک گئے ہیں اور دل یقین اور بے یقینی کے صدر لمحے پر بھٹک رہا ہے۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ میری چھوٹی چھوٹی بات پر کرب کی تصویر بن جانے والا مہربان وجود پچھلے چھ ماہ سے زندگی کے بڑے بڑے دکھوں میں دستگیر نہیں رہا۔ یہ حقیقت تلخ مگر کتنی اٹل ہے کہ تین جون کی شام میں نے ایک ساتھ بہت سے رشتے کھو دیئے۔ ایک شخص کے جانے سے بیک وقت باپ، بھائی، دوست، استاد، غمگسار اور جانے کیا کیا تہِ خاک چلا گیا۔ لیکن اندر کوئی ہے جو اس ظلم کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ اسے تسلیم نہیں کرتا۔ مجھے لگتا ہے ہمیشہ کی طرح ابھی دروازہ کھلے گا اور ہزار رشتوں والا میرا ایک رشتہ دار اندر داخل ہوگا۔ چمکتے ہوئے سفید لباس میں ملبوس، دمکتی آنکھوں سے محبت برساتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرے گا اور کہے گا "آج پھر میں نے بیٹی کے بال خراب کر دیئے!" اس کی شفقتوں کا وفور میری پوری ذات میں روشنی بن کر سرایت کر جائے گا۔ میں کیا بتاؤں اُس بظاہر کمزور وجود میں کتنے بڑے بڑے پہاڑ ایستادہ تھے جس کا ایک حصہ بھی ان کے عزیزوں کے وجود میں پیوست ہوتا تو وہ شہ زور بن جاتے۔ ناقابلِ شکست ہو جاتے۔ کتنے کم لوگ زندہ رہنے میں یوں مدد کرتے ہیں جیسے وہ کرتے تھے۔ اس دورِ نابرساں میں اُن کی محبت سراسر پرسشِ غم تھی۔ ہر ایک کو اپنی چھاؤں کے نیچے پناہ دینے تھے حتیٰ کہ پناہ لینے والوں کی افراط سے اُن کی چھاؤں چھدری ہونے لگتی۔ کبھی کبھی تھکن ان کے لہجے میں در آتی مگر صرف چند لمحوں کے لیے۔ پھر وہی شفقت، وہی مامتا "چل کوئی نہیں پُتر، ڈال لینے دے سب کو بوجھا، اپنا سمجھ کر کرتے ہیں نا، مان سے!" مان دینا تو اُن پر ختم تھا۔ کبھی میں پوچھتی "انکل جعفری! آج آپ کے پاس کچھ وقت ہوگا؟" جواباً ناراض ہو جاتے "یہ پوچھنے کا کیا مطلب ہے؟ تو نے یہ کیوں پوچھا پُتر، تو یہ نہ پوچھا کر۔ صرف حکم کیا کر۔ ہم تو تیرے نوکر چاکر ہیں۔ تیرے لیے وقت نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" مارے غرور اور اتراہٹ کے میرا سر آسمان سے جا لگتا۔ عیدوں پر، دوسرے تہواروں پر بہت پُرجوش آتے عیدی تھماتے ہوئے کہتے "یہ لے بیٹا تیرے قرضے کا ایک حصہ" پھر بابا سے مخاطب ہو کر کہتے "سر جی، ہم تو سدا کے مقروض ہیں اس کے کبھی بیٹیوں کے قرضے بھی اترے ہیں؟" کبھی ہم باپ بیٹی اور کبھی میں اکیلی ان کے ہاں جاتی تو جشن کا سماں کر دیتے۔ اپنے لیے اتنا اہتمام ہوتے دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی۔ میں کہتی "انکل منع کریں ناسب کو" جواباً مصنوعی ناراضی دکھاتے "کیوں منع کروں بھئی کرنے دے سب کو، اس گھر میں بیٹی سے بڑا مہمان بھی کوئی آسکتا ہے بھلا؟" ان کے پاس جاتے ہی اپنا آپ ایک دم اہم لگنے لگتا۔ کبھی کسی بات پر پریشان دکھتے تو بے چین ہو کر کہتے "دیکھ بیٹا، تو نے رونا نہیں۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میرا بلڈ پریشر ویسے ہی زیادہ ہے آج اور یوں بھی میں تیرے آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ میرے کیا، کسی کے بھی آنسو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اکثر بابا کا شعر دہراتے:

ہم نسوؤں نے عجب انداز میں سیراب کیا
کہیں بھیگے ہوئے دامن کہیں باطن نم تھے

لیکن اپنے آنسوؤں پر انھیں کوئی اختیار نہ تھا۔ اپنے پیاروں کے لیے ان کے دل اور آنکھوں میں ہر وقت ایک آتشِ سیال کسی ہلکے سے اشارے کی منتظر ہوتی تھی۔ میں آپریشن کے بعد ہسپتال میں تھی۔ دن میں دو دو تین تین مرتبہ آتے۔ اُن کے چہرے پر ایک تناؤ ہوتا اور کبھی کبھی اتنا شدید کہ اُلٹا مجھے تسلی دینا پڑتی۔ مجھے ابھی تک اُن کی وہ نرم آواز یاد ہے۔ جو میں نے نیم غنودگی میں سُنی تھی "میرے بیٹے کو زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟ دیکھنا تم میرا بچہ کتنی جلدی ٹھیک ہو جائے گا" اور تسلی دیتے دیتے ان کی اپنی آواز رُندھ گئی تھی۔ منظر کو گلے میں انفیکشن کی وجہ سے ہسپتال داخل ہونا پڑا۔ میں اور بابا اسے دیکھنے گئے۔ کمرے سے باہر ہی انکل جعفری مل گئے۔ بابا کے گلے لگ کر بچوں کی طرح رونے لگے، بار بار یہی کہتے "منظر بڑی تکلیف میں ہے۔ سر! دعا کریں کوئی خطرناک بات نہ ہو"۔ ہم سب کے پیارے حفیظ تائب صاحب کی بیماری نے تو انھیں ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے اکثر کہتے۔ "یہ قدرت کے بھید بھی عجیب ہیں۔ ایسا ایسا ظالم دندناتا پھرتا ہے اور میرا یار جو ساری عمر نعتیں لکھتا رہا، حمدیں لکھتا رہا، بستر پر پڑا ہے"۔ ایک روز آئے تو مجھے بجھے بجھے تھے۔ کہنے لگے "برج میں بہت اداس ہوں، اس لیے کہ ضیاء الدین ضیاء اداس ہے"۔ فقرہ مکمل ہونے سے پہلے دو آنسو اُن کی آنکھوں سے لڑھک آئے تھے۔ بابا کو "ہر پیز" ہو گئی۔ اُن دنوں انکل جعفری کی بے چینی دیکھ کر مجھے خوف آنے لگتا۔ ماہیِ بے آب کی طرح مضطرب رہتے۔ مجھے فون کرتے اور بیک وقت دو فرمائشیں کرتے "مجھے سچ سچ سارا حال بتاؤ پریشانی کوئی بُری خبر نہ سنانا" میں خود بدحواس تھی لیکن بابا کے ساتھ اتنی ہی تیمارداری انکل جعفری کی بھی کرنا پڑتی کیونکہ اُن کے اعصاب مستقلاً نروس بریک ڈاؤن کے ڈینجر زون پر تھے۔ وہ اُسی دن مسکرائے جس دن بابا کے زخم مکمل طور پر مندمل ہو گئے۔ ورنہ بیس بائیس دن اُن کے آنسو مسلسل گرتے رہے، کبھی اندر کبھی باہر۔ ہر وقت یہی کہتے "میری تو کل کائنات، ساری دولت یہی ایک شخص ہے۔ میرے پاس اور رہے کیا اسے کچھ ہو گیا تو میں اُجڑ جاؤں گا۔ ندیم صاحب کو جلدی ٹھیک ہو جانا چاہیے میرے اندر سے تو اتنے دنوں میں ہی سارا خون نچڑ گیا ہے۔ آج صبیحہ صغریٰ (اُن کی بیگم) بھی کہہ رہی تھی کہ ندیم صاحب ٹھیک ہوں گے تو آپ کا کھانا پینا شروع ہو گا"۔ بابا کے لیے ان کی محبت تھی ہی ایسی۔ لوگوں نے تو مجنوں اور رانجھے کو داستانوں میں دیکھا ہے میں نے بابا کے حوالے سے اُن کے روپ میں بہت سے رانجھے اور مجنوں یکجا دیکھے۔ ایک ہی راست قبلہ ــــ بابا کے ہر بد خواہ اور حاسد کے خلاف، ان کا غیر مشروط اعلانِ جنگ تھا، اور چاہنے والوں کے لیے بے پناہ فراخ سینہ۔ ان کی محبت میں پنجاب کے دیہات کی سی شادابی اور سادگی تھی۔ شہر اور پھر شہر میں کسٹم کا سا محکمہ بھی انھیں چالاک نہ بنا سکے تھے۔ چالاکی ان کی Genes میں سما ہی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ ان میں پہلے ہی محبت اتنی ناقابلِ یقین افراط سے موجود تھی کہ اور کسی چیز کی گنجائش ہی نہیں بچی تھی۔ وہ سکھ دے کر دکھ سمیٹنے والے قبیلے کے فرد تھے۔ اکثر کہتے "کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"! اُن کی محبت میں لفظ کم تھے۔ بس عمل ہی عمل تھا۔ ان کا بس چلتا تو بابا کو ایک اینٹی بکٹیریا گلاس میں سنبھال کر سجا سنوار کر رکھ لیتے۔ دنیا کے ہر سرد و گرم سے محفوظ کر لیتے۔ ہر وقت مجھ سے کہتے "بس ایک دکھ ہے ندیم صاحب کی خدمت نہ کر سکا" میں تردید کرتی تو کہتے "یہ کچھ بھی نہیں یہ تو اس کا ہزارواں حصہ بھی نہیں، جس کے وہ حقدار ہیں یا جس کی میرے دل میں خواہش ہے"۔ یہ الفاظ اُن کے جذبات کے صحیح ترجمان تھے۔ بابا تھے ہی اُن کے محبوب اور وہ بھی ایسے جن کے لیے وہ اکثر سلطان باہوؒ کا یہ شعر پڑھتے:

اِک اِک لُوں وچ سو سو چشماں اک کھولاں اِک بجاں

بابا کے سامنے ان کی ایک ادا بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ کسی بات پر کتنا ہی اختلاف ہوتا کبھی کہہ نہ پاتے۔ بلکہ کبھی تو ایسا ہوتا کہ

ہم پہلے سے کسی بات پر بحث کر رہے ہوتے۔ انکل جعفری کا نقطۂ نظر بابا سے مختلف ہوتا بلکہ بہت شدت سے مختلف ہوتا۔ لیکن بابا کے آتے ہی وہ چپ سادھ لیتے۔ میرے لاکھ بھڑکانے پر بھی کچھ نہ بولتے۔ کبھی کبھی میں خفا بھی ہو جاتی کہ — "یہ کیا بات ہوئی۔ میں تو اپنا ہر اختلاف بابا کو بتا دیتی ہوں اور بابا اُسے بہت فراخ دلی سے سُن بھی لیتے ہیں۔ ہم دوستوں سے کھل کر بات نہیں کریں گے تو اور کس سے کریں گے" وہ میری ساری بات بہت سکون سے سنتے رہتے، پھر مسکرا کر کہتے "تو ٹھیک کہتی ہے پُتر! دوستوں سے کھل کر ہی بات کی جاتی ہے۔ پر تجھے کس نے کہا کہ وہ میرے دوست ہیں، دوستی تو برابری کا رشتہ ہے اور میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں۔ رہی تیری بات تو تو بیٹی ہے، اختلاف کر سکتی ہے، جنگ کر سکتی ہے مگر تیرے مقام پر ہمارے تو فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں"۔ میں پھر میں کلیں بور ڈ ہو جاتی اور میرے پاس انھیں چھیڑنے کے سوا کوئی راستہ نہ رہتا۔ اکثر میں انھیں یہ شعر سنا کر چڑاتی تھی:

یوں آبرو بنا دے دل میں ہزار باتاں
جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

مگر بابا کے لیے انھیں گونگے بن کا یہ اعزاز قبول تھا، بلکہ اس پر فخر تھا۔ میں اکثر دیکھتی وہ خاموش بیٹھے بابا کو دیکھتے رہتے، دیکھتے رہتے، پھر جاتے ہوئے کہتے "بیٹا میں بھی ندیم صاحب نظر اُتار دوں گا۔ تو بھی اتار دینا۔ کسی غریب کو ڈھونڈ کے خیرات کر دینا بچھترویں سالگرہ کے جشن کے فوراً بعد بابا بیمار ہو گئے تو انکل جعفری بار بار یہی کہتے "بس لگا دی سب نے نظر پچھتر سالہ جوان کہہ کہہ کے۔ تجھے منع کیا تھا نہ کر یہ تقریب، خواہ مخواہ پتہ لگے گا لوگوں کو کہ خیر سے پچھتر سال کے ہو گئے ہیں اور اس سال ۲۰ نومبر کو بابا کے یوم پیدائش پر میں یہ سوچتی رہی کہ انکل جعفری نے آخر اپنی بات منوا ہی لی۔ اس سال ہم نے بابا کی سالگرہ نہیں منائی۔ بھیگے زخمی ہونٹوں سے کیسے مسکراتے؟

ان کی دو کمزوریاں تھیں، ایک احمد ندیم قاسمی اور دوسری ان کی شاعری۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ ہر لمحہ شاعری میں سانس لیتے تھے تو غلط نہ ہو گا۔ شاعری ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر وہ گھنٹوں بول سکتے تھے۔ ہم میں سے بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ اُن کی کم فرصتی نے ہمیں ایک بہت نقاد سے محروم کر دیا۔ یوں تو ہر شاعر کے اندر ایک نقاد موجود ہوتا ہے، بلکہ میرا ایمان تو یہ ہے کہ جتنا بڑا نقاد ہوتا ہے اتنا بڑا شاعر ہوتا ہے، لیکن یہاں بڑے نقاد سے میری مراد خود تنقیدی کے عمل سے آگے دوسروں پر تنقید کرنے والے سے ہے جس میں درکار تین بڑی خوبیاں — بے تعصبی، متوازن نقطۂ نظر اور وسیع مطالعہ — اُن کے پاس موجود تھیں — اور اس پر مستزاد اُن کی بلا کی یادداشت — ملکی، غیر ملکی اساتذہ سے لے کر جعفر بلکہ جونیئر شعراء تک کا انھیں بے شمار کلام یاد تھا۔ بہت سے اشعار میں نے پہلی دفعہ انھی سے سُنے۔ چھپنے والی تقریباً ہر نئی کتاب پر ہماری ایک نشست ضرور ہوتی تھی جس میں کبھی کبھی بابا بھی شامل ہو جاتے۔ انکل جعفری کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ شعر کی کمی اور حسن کی بات کرتے ہوئے شاعر کے کلام سے حوالہ ضرور دیتے تھے اور آج کل کے بیشتر نقادوں کی طرح خدائی فوجدار کا منصب سنبھال کر نہ تو لکھنے والے کو یک قلم مسترد کرتے تھے اور نہ ہی بلاوجہ آسمان پر بٹھاتے تھے۔ خود ایک بالکل مختلف لب و لہجے کے مالک تھے لیکن اپنے سے جداگانہ آوازوں کے لیے دل کشادہ رکھتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی کسوٹی سخت تھی۔ البتہ غیر منصفانہ نہیں تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی تنقیدی رائے پر ان کے ذاتی مراسم اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ اس کے برعکس صورت یہ تھی کہ اُن کے مراسم اُن کی ادبی گریڈنگ کے تابع ہوتے تھے۔ شاعری اور فن اُن کے لیے زندگی کا بنیادی رویہ تھے۔ وہ جس کو بھی گلے لگاتے، اندر سے پہلا مکالمہ فنی سطح پر ہی ہوتا تھا۔ اس کے بغیر رشتے اُن کے لیے محض رسمی رہتے۔

وہ لفظ کو Divine کہتے تھے، اور زندگی میں اس کے کردار کو الہامی۔ ہماری گفتگو اگر اس موضوع پر رہتی۔ وہ لفظ کے معنی اور جمالیات دونوں کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ ان کے ہاں لفظ اپنی ایک مکمل شخصیت ملی، جو صرف ذوقِ جمال کو ہی تسکین نہیں دیتی تھی، بلکہ ذہن کی تہہ در تہہ زرخیزی میں اضافہ کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اُن کے ہر ہر لفظ کے ساتھ ایک جگنو بندھا ہے، جو جلتا بجھتا ہوا صرف حسن کاری ہی نہیں کرتا، راستہ بھی دکھاتا ہے۔ مان کے بقول

مسافت سطر سے تا سطرِ کس سورج پہ طے ہوگی
کوئی ٹکڑا فلک کا ہاتھ آئے تو رجز لکھیں

قلم تجسیم کیا لکھے
سکوتِ سایۂ اشکِ رواں میں بھیگتے کاغذ یہ نادم آنکھ فریادی
کہ آنسو انتہائے کار میں بھی لفظ سا قاصد نہیں ہوتا

پھر اسی نظم میں کہتے ہیں:

نوائے خود گرفتہ سے سرودِ اجتماعی تک
بہت دشوار ہے رستہ
قدم اندر قدم عمروں پہ پھیلا تجگا ــــ بیداریٔ شب ہے
محدب آئینے ــــ معکوس آوازوں کی جھلمل ــــ آڑے ترچھے خط
بہت کچھ، بحرِ باقی ہے (سخن درماندہ ہے)

اپنے فنی سفر میں ایک فرسٹریشن انھیں پریشان کرتی رہی کہ لوگ ان کے حوالے سے ابلاغ کا مسئلہ کیوں اٹھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ وہ نظم مونتاج کی صورت میں لکھتے ہیں جس میں تمام Images کسی نہ کسی صورت مرکزی خیال سے منسلک ہوتی ہیں۔ ان امیجز کو آپس میں مربوط کرنا اُن کے نزدیک نظم کی Over-paraphrasing کے مترادف تھا۔ ان کے خیال میں نظم کی تفہیم میں کچھ کام پڑھنے والوں پر بھی چھوڑ دینا چاہیئے۔ میں ان سے بیشتر متفق تھی مگر تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ــــ جو اس سلسلے میں اُن کی حساسیت کے باوجود میں وقتاً فوقتاً بیان کرتی رہتی تھی۔ میرا موقف یہ تھا کہ ہمیں قاری کے لیے ہر چیز Over-explain تو ہرگز نہیں کرنی چاہیئے لیکن اُس پر امیجز میں Coherence کا بوجھ بھی نہیں ڈالنا چاہیئے۔ رمز و کنایہ سے ہلکا پھلکا اشارہ دے کر اُس کی مدد ضرور کرنی چاہیئے کیونکہ ضروری نہیں کہ Images اسی مفہوم اور تسلسل سے اُس کے ذہن میں بھی موجود ہوں جیسے وہ شاعر کے ذہن میں ہیں اور نظم ایک اکائی کی صورت اس پر منکشف ہو سکے۔ وہ بھی اس بات کے قائل تھے لیکن مسئلہ تھا اُن کے Plane کا۔ میرے خیال میں اُن کے اور عام قاری کے درمیان کا فاصلہ نظم کی ہیئت (Form) یا لفظوں کی بُنت کا نہیں بلکہ اُس "ذہنی اور روحانی سطح" کا تھا جس پر بیٹھ کر وہ تخلیقی تجربے سے گذرتے تھے اور زندگی کرتے تھے۔ دونوں محاذوں پر اُن کی دنیا اپنے گرد و پیش سے بہت مختلف اور برتر تھی۔ ان کا شعری اور شخصی Potential بے پناہ تھا۔ ایک خاص معیار سے نیچے اترنا ان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ ان تک پہنچنے کے لیے چڑھائی کا تھوڑا سا سفر کر لیا جاتا۔ اور چونکہ چڑھائی کا سفر عموماً دشوار گذار ہوتا ہے اس لیے

یار لوگوں نے انھیں نارسا اور دور از کار سمجھنے پر اکتفا کر لیا، ورنہ اُن کی شاعری کے ایک ایک لفظ میں اس شخص کی زندگی دھڑکتی ہے جس نے پلوں میں صدیاں گذاری ہیں اور زندگی کے سب بگولے اپنے بدن پر جھیلے ہیں۔ اپنے ماحول کی کمزوریوں، اور دکھوں کو لہو میں اتار کر انھیں اپنی طاقت بنایا ہے۔ اتنے تیز رو ذہنی سفر میں ماحول سے کٹ جانے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ لیکن یہ خطرہ بہت مبارک ہے کہ ارتفاع (Sublimation) کے مختلف درجے اس کی منزلیں ہیں۔ ایسی دنیا کے تخلیق کار کبھی کبھی اپنی ذہنی کیفیتوں میں گرد و پیش سے اوپر اُٹھ جاتے ہیں۔ وہ نئی دنیائیں جنم دے رہے ہوتے ہیں۔ جبکہ ہم لوگ انھیں حقیقت سے انحراف کا مجرم قرار دے ڈالتے ہیں۔ انکل جعفری کا تخیل اُن نئی دنیاؤں میں رنگ اور روشنی کی آمیزش سے ایک ساحرانہ سی فضا قائم کرتا تھا۔ لیکن ذرا سا غور کرنے پر ہم ان میں اپنا ماحول، اپنی گلیاں، اپنی مٹی کی خوشبو، اپنا دھندلا آسمان اور اپنے مجبور دور کا سارا آشوب دیکھ سکتے ہیں، محسوس کر سکتے ہیں۔ ہاں مگر اس سیرِ جہاں کے لیے تیسری آنکھ کی ضرورت ہے جسے دیدۂ دل بھی کہتے ہیں مستقبل میں جب کچھ دیدہ ور انکل جعفری کی دنیائیں سر کر کے لوٹیں گے اور اپنے تجربات لکھیں گے، تب دوسرے لوگ جان سکیں گے کہ اس زمین پر اور کتنے منطقے آباد ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ عالی دماغ لوگوں کو عام ذہنوں تک پہنچنے کے لیے ہمیشہ ہی ایک میڈیم کی ضرورت رہی ہے۔

انھی کے کہنے کے مطابق گذشتہ دس برس میں اُن کی ہر نظم کی پہلی سامع میں ہوتی تھی۔ نظم سناتے ہوئے وہ سر سے پاؤں تک شعر کی فضا میں ڈوب جاتے تھے۔ ۳۰ مئی ۱۹۹۲ء یعنی اپنی رخصت سے صرف چار روز قبل وہ ابا کے دفتر آئے، بابا ریڈیو سٹیشن گئے تھے۔ انکل جعفری نے مجھے اپنی تازہ (اور اب آخری) نظم "آخری اجالا" سنائی:

تھکے ہوئے آفتاب! تیرے غروب کا وقت آگیا ہے
تھکے ہوئے آفتاب! تیرے سفر کی مٹی میں میرا چہرہ ہے
میرے چہرے پہ منجمد اشک، داغ، دشنام، میری ساعت،
مرا زمانہ، مرا جہاں ہے
کہ میں نے یہ داغ اپنے ابا کے زرد رخسار پر بہنگامِ مرگ، دیکھا تھا
میرے بھائی کی لاش پردیس سے جب آئی تھی، اُس کے تابوت پر
کچھ ایسے ہی نقشِ ضربات تھے نشان تھے
تھکے ہوئے آفتاب! تیرے اس ایک پل اور میرے لمحے میں
کوئی تاریخ کا تصادم ہے یا تسلسل ہے یا کوئی جبر مشترک ہے

یہ نظم سنتے ہوئے اور بعد میں بھی، میں ایک عجیب تجربے سے گذری یوں لگا جیسے اندر ہی اندر کوئی چیز مسل رہی ہے۔ دل میں بہت گھٹن اور اداسی بھر گئی تو میں گھبرا کر باہر نکل آئی لیکن باہر شام بھی بہت زرد روسی لگی۔ ذہن نظم کی بازگشت کے گھیراؤ میں تھا۔ میں اس گونج سے نجات پانا چاہتی تھی لیکن ہزار کوششوں کے بعد بھی کامیابی نہ ہو سکی۔ اگلے روز میں نے انھیں دفتر فون کر کے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ میرے پاس تھے اور کہہ رہے تھے "کمال ہے بیٹا! تو خود شاعرہ ہو کے نہیں سمجھی کہ ہم لوگ تو یونہی اُلٹی سیدھی ہانکتے رہتے ہیں۔ جو جی میں آیا لکھ دیا۔ تو فکر نہ کر، میں نے اللہ میاں سے مہلت مانگی ہے کہ جب تک سعدیہ (چھوٹی بیٹی) گھر سے نہیں چلی جاتی، وہ میرے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے میں تو بڑے سکون سے اپنی ریٹائرمنٹ کی طرف

بڑھ رہا ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تیرے ساتھ بہت سی نشستیں کرنا ہیں اور بہت لکھنا ہے۔ تو نظم کو چھوڑ! یہ بتا کل تیری سالگرہ پہ ٹیکسی کتنا لگے گا؟"

میری سالگرہ میں انھوں نے حسبِ معمول بہت جوش و خروش سے حصہ لیا۔ مجھے کہنے لگے "ہم تم کتنے خوش نصیب ہیں کہ عہدِ ندیم میں زندہ ہیں۔ بس تم یہ دعا کرو کہ میں اپنی آنکھوں سے ان کا کوئی دکھ نہ دیکھوں۔" میں نے آمین کہی۔ لیکن تیسرے ہی دن کی شام اس دعا کی قبولیت جس انداز سے ہوئی اس نے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ـــــ جسم و جان کی دیواروں کے اندر وہ زلزلہ اب بھی جاری ہے۔ اردگرد کا سارا ماحول ایک بہت گہرے سنگین سمندر کے پاتال میں اتر گیا ہے اور اندھیر یہ ہے کہ دھکیاں دے دے کر خاموش کرانے والا کہیں نظر نہیں آتا۔

انکل جعفری! آپ کو تو اپنے پیاروں کے نشیب بہت دکھ دیتے تھے۔ اتنے کہ آپ انھیں بازو سے پکڑ کر باہر نکالنے کے لیے زندگی بھر اُن کے نشیبوں میں اترتے رہے۔ آپ کے بغیر ہم سب اور اُردو شاعری ایک بہت گہرے نشیب میں گر گئے ہیں، ہمیں کون باہر نکالے گا؟ یہ تو بڑی بے ایمانی ہے نا کہ میرے قرضے چکائے بغیر آپ نے چپ چاپ ہی راستے بدل لیے۔ آنے والی عید پر آپ کا قرضہ کون اتارے گا؟ ادبی نشستوں کا، بہت سی نظموں کا وعدہ کون پورا کرے گا؟ ایک بات تو بتائیے کیا مٹی میں اتنی طاقت ہے کہ وہ محبت کے اتنے بڑے ہمالہ کو چھپا سکے؟ اتنی بہت سی کرنوں کو روپوش کر سکے؟ کیا سورج تہہِ خاک جا سکتے ہیں؟ شاید جا ہی سکتے ہیں، کیونکہ کچی آنکھوں سے ایک جنازہ دیکھ لینے کے بعد میری بینائی گونگی ہو گئی ہے۔

احمد ندیم قاسمی

کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ

تہذیب و فن

نئی کتابت اور خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ

شائع ہو گیا ہے

قیمت : ۱۴۰ روپے

منٹو کے خط ندیم کے نام

صاف ستھری کمپیوٹر پرنٹنگ کے ساتھ

شائع کر دیئے گئے ہیں

قیمت : ۱۰۰ روپے

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز۔ لوئر مال۔ لاہور

جاوید انور

میں تیرا نوحہ کیسے لکھوں!

اختر حسین جعفری کے لئے

کہیں اک نقطے کی سُوئی پر
برسوں کی چُپ کا کفّارہ
کہیں سُرخ ربن کا تار کوئی
کہیں زُلف کا صندل بکھرا ہے
میں تیرے حرف کے زینے پر
مَیں تیری سطر کے شہر میں ہوں
میں تیرا نوحہ کیسے کہوں!

تجھے مجھ کو ابھی دکھانا ہے
وہ خواب کہ تُو نے دیکھا تھا
ابھی میرے دریا بھنور بھنور
ابھی میرے بادل دھواں دھواں
تجھے اپنی نظم سُنانا ہے
مجھے اپنی پیاس بُجھانا ہے

مجھے شام کے خالی رستوں پر
ابھی تجھ سے ملنے آنا ہے
میں کیسے وصل کی شاخوں سے
ابھی تیرے ہجر کے پھُول چُنوں
میں تیرے ہجر کے زینے پر
مَیں تیری سطر کے شہر میں ہوں
میں تیرا نوحہ کیسے لکھوں!

اشرف جاوید

شجر رزقِ خاک بنتا ہے

اختر حسین جعفری کا نوحہ

مجھے اک نظم لکھنا ہے
مجھے خود تعزیت کرنا ہے اپنے سے
مگر میں نظم کیا لکھوں!
کروں میں تعزیت کیسے!
شکستِ آئنہ خانہ
طلوعِ اشک کا موسم
دکھائی کچھ نہیں دیتا
سُجھائی کچھ نہیں دیتا

قلم کی آنکھ میں محفوظ حرفِ نو لہو کی سطر بنتا ہے
میں اپنی انگلیوں کو کاٹ لیتا ہوں
کہیں قرطاس پر ٹوٹا ہوا اک استعارہ
نظم کا عنوان بنتا ہے

فشارِ خواب بر پا ہے
شجر گرتا ہے، رزقِ خاک بنتا ہے

سرِ شاخِ سخن طائر قبائے چشمِ نم اوڑھے ہوئے
خاموش بیٹھا ہے
ہوا کی لے سُلگتی ہے تو پھولوں پر کوئی نوحہ اُترتا ہے
کسی کہسار کا نوحہ

سرِ دشتِ طلب حرفِ وفا کے پھول کھلنا تو نہیں ممکن
مرے آنگن میں اک "نخلِ نوا" ہے —— اور
میں اس پر کھلے سب پھول تیری نذر کرتا ہوں
کہ خود سے تعزیت کرنے کا فن مجھ کو نہیں آتا

ناہید شاہد

ہَوا نوحہ کناں ہے

اختر حسین جعفری کے لیے

ہوا نوحہ کناں ہے، شام کے منظر نہیں کھُلتے
قفس میں قید ہیں ساری رُتیں خاموش بیٹھی ہیں
یہاں آسیب ہے کس کا
کہ ظالم ہاتھ سے تلوار گرتی ہے تو پھر سے ڈھال لی جاتی ہے
لمحوں میں

صبا حیران رہتی ہے
دعا دو لخت ہوتی ہے

ہوا نوحہ کناں ہے صبح نے بستر اُٹھایا ہے
تھکن تازہ ہے، کیونکہ اسپ پھر تیار ہیں اُس سمت جانے کو
جہاں آنسو نہیں ہوتے
چراغوں سے جہاں جھڑتے نہیں ہیں پھول سرسوں کے

رُکو، ٹھہرو، اُٹھاؤ ہاتھ، گاؤ اور سجاؤ نظم ہونٹوں پر
ردائے گل کھُلی ہے جس میں مشتِ خاک لپٹے گی
ابھی اک نظم اُتری تھی، ابھی اک نظم اُترے گی
نیا لمحہ، نئے موسم کے ہاتھوں میں نئی آباد بستی کا نیا چہرہ
ترے ہی آئینہ خانے میں اپنی ساری صبحیں، ساری شامیں دیکھ پائے گا
ہوا پھر گنگنائے گی....

حسن عباس رضا

"آئینہ خانہ" اب بھی روشن ہے

جب کبھی شہرِ کم نگاہ میں ہم
مسخ ہوتی سیاہ شاموں میں
اپنی پہچان بھول جاتے تھے
ہم تجھے آئنہ بناتے تھے
تجھ سے اپنا سراغ پاتے تھے

جب کبھی بادِ جبر کی زد میں
بجھنے لگتے تھے خواہشوں کے دیئے
ہم ترے مہرباں وجود کی لَو
بامِ اُمید پر سجاتے تھے
تجھ سے اپنا سراغ پاتے تھے

جب کبھی ساکنانِ شہرِ سخن
حبس کی بے چراغ راتوں میں
اپنی سانسیں شمار کرتے تھے
ہم ترا انتظار کرتے تھے

ہم ترا انتظار کرتے تھے
اب ترا انتظار کون کرے ؟
اب کہاں حرف کی ولایت میں
تجھ سا روشن دماغ اُترے گا؟
اب کہاں عارضِ تمنّا سے
فرقتوں کا یہ داغ اترے گا؟

اب تو شہرِ سخن کی آنکھوں میں
درد کی گرد کا بسیرا ہے

شہرِ جاں ہو گیا کھنڈر، لیکن
نقشِ آئینہ گر سلامت ہے
اب بھی ہم اپنے گمشدہ چہرے
پیشِ آئینہ دیکھ سکتے ہیں
نقشِ آئینہ گر سلامت ہے
"آئینہ خانہ" اب بھی روشن ہے

تصدّق شعار

اختر حسین جعفری کی روح سے

وہاں مَیں بھی گیا تھا
بزم جو تیرے لیے مخصوص تھی
لیکن بڑا پہرا تھا ہر جانب
کئی آتے تھے اور سیدھے گزر جاتے تھے
لیکن ایک باوردی سپاہی
ہاتھ میں سنگین تھامے
میرے رستے میں کھڑا تھا
میں نے اُس سے عرض کی
مجھ کو بھی جانے دو
مجھے بھی بولنا ہے، بات کرنی ہے
مجھے کہنا ہے
میں نے ایک بار اُس سے قلم مانگا تھا
اور اُس نے کہا تھا بھیج دوں گا
میں نے پوچھا تھا کہ "میرے گھر نہ آؤ گے!"
تو وہ بولا تھا "آؤں گا"
میں اُس سے کچھ بھی کہتا تھا
تو میری مان لیتا تھا

مگر چوکس سپاہی نے مجھے پیچھے دھکیلا
اور کہا
جاؤ!
کہیں سٹھیا گئے ہو
بہکی بہکی مجھ سے باتیں کر رہے ہو
جاؤ، اور سُن لو
یہاں وہ لوگ آتے ہیں
جنہیں اُس کوہ قامت سے علاقہ ہو
نجانے تم کہاں سے آ گئے ہو
کون ہو
کیا کام کرتے ہو!

تصدّق شعار

مدیرِ "فنون" سے

اختر حسین جعفری کی نذر

مدیرِ محترم!
جب بھی کبھی تُو نے
مجھے نظموں کے حصّہ کی کتابت دی
بہت کہنہ قلمکاروں کے لنگڑاتے ہوئے مصرعے
ترے دستِ ہنر کے آسرے سے ٹھیک چلتے تھے
کہیں شوشہ، کہیں قومہ
کہیں نقطے، کہیں گرہیں
ضرورت کیا نہ پڑتی تھی
مگر اک نظم گو ایسا تھا
جس کی فکر سے نکلے ہوئے لفظوں پہ اُنگلی کٹ کے گرتی تھی
اور اُس کے ہاتھ کا لکھا کبھی تُو نے نہ بدلا تھا
مگر تُو آج کیوں مجھ کو اُسی اک نام کو
اک چوکھٹے میں بند کر دینے کو کہتا ہے

عابد ودود

بصیرتوں کے نقیب!

بصیرتوں کے نقیب!
کتنا اداس ہوں میں
کہ اس وطن میں نہیں ہوں جس میں
تُو جی رہا تھا
تُو بس رہا تھا
جہاں سب احباب کو تری قربتیں میسّر تھیں
وہ تری گفتگو سے کسبِ کمال کرتے تھے
اور تیرے جمالِ فن کو سراہتے تھے

بصیرتوں کے نقیب!
تیرے بغیر الفاظ کھو رہے ہوں وقار جیسے
حروف سے اُمڈی پڑ رہی ہوں کراہیں جیسے
تمام افکار رو رہے ہیں
تمام معیار رو رہے ہیں

(بریڈفورڈ)

اختر حسین جعفری کی یاد میں

نشاط انجم

گوجرانوالہ شہر کی عظمت اور تابندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس شہر کی ہواؤں میں ایک عظیم اور سچے انسان اختر حسین جعفری کے سانسوں کی مہک رچی بسی ہے۔ اسی شہرِ بے مثال کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اختر حسین جعفری کی معرکتہ الآرا کتاب "آئینہ خانہ" بھی یہیں تخلیق ہوئی۔ اس کتاب کی تخلیق کے دوران میں مجھے جعفری صاحب سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوا۔ کتاب کی اشاعت سے پہلے اُن کی نظمیں سُنتا رہا۔ ان نظموں کے پس منظر، پیش منظر اور مَنظر کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اس کتاب کی تخلیق کے دوران میں مجھے محسوس ہوا کہ جعفری صاحب ایک تخلیقی معیار اور سچائی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے تھے۔ اُنہوں نے خود اپنے آپ پر اور اپنے ہر لفظ پر تنقید اور احتساب کے پہرے بٹھا رکھے تھے۔ وہ لفظ کا استعمال خوب جانتے تھے اور اظہار و بیان کی تمام صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اس کے باوجود وہ انتہائی ٹھوس رویّے پر یقین رکھتے تھے۔ وہ لفظوں سے حُسن و جمال کے ایسے پیکر تراشتے تھے کہ اُن کی مشکل پسندی کے باوجود انہیں بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ مطالعے کی وسعت، تجربے کی گہرائی، مشاہدے اور احساس کی شدت نے اُن کے فکری محاسن کو وہ جلا بخشی کہ اُن کی سوچ کے دھارے بدل گئے۔ اُردو ادب، فارسی ادب اور انگریزی ادب کے ذوقِ مطالعہ نے اُن کی شخصیت کو سرآئینہ بنا دیا۔ خود انہوں نے اپنی کتاب میں اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"شعری تمثیلات اور پیکر سازی کے حوالے سے ترسیل میں نو بہ نو پیرہن تلاش کرنے کی خُو کے اشارے مجھے غالب، ایذرا پاؤنڈ، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ جیسے مستند ہنر مندوں اور پیبلو نرودا، رابرٹ فراسٹ جیسے باصلاحیت ہم فکر اور ہم عصر رفقائے کار کی علمی مصاحبت میں ملے ہیں"

"آئینہ خانہ" کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اختر حسین جعفری نے ایک نئی شعری زبان بھی تخلیق کی ہے۔ اس شعری زبان کا خمیر اُنہوں نے ہماری ہی تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے اُٹھایا ہے۔ اس نئی شعری زبان کے حوالے سے اُنہوں نے لکھا ہے:

"شعری زبانیں، شہروں کی طرح بنتی، سنورتی، بگڑتی اور اُجڑتی رہتی ہیں مگر دلہنوں کو سہاگ کے بول اور ماؤں کو دُعا کے لیے پھول ہر باغ، ہر عہد سے ملتے رہتے ہیں۔ بولنے والے اپنی مادی، عسکری اور تہذیبی قوت کے سبب اپنی زبان کو فاتح زبان کا درجہ دلاتے ہیں اور مفتوح زبانیں جنگ کا تاوان اپنے تہذیبی ورثے سے جزوی یا کلی دستبرداری کی صورت میں ادا کرتی رہتی ہیں تاہم شکست و ریخت کے اس عمرانی عمل کے باوجود ہر زندہ زبان کا ایک اپنا ملک، ایک اپنا آسمان اور اس آسمان میں ایک الگ کہکشاں ہوتی ہے جس کے اندر حروف و الفاظ اجرامِ فلکی کی صورت اپنے اپنے معنوی مدار کے اندر سال ہا سال تک حرکت پذیر رہتے ہیں اور متعین مدار کے اندر گردش کا یہ تسلسل اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ کسی دوسرے فکری سیارے کی زبردست کشش ثقل انہیں ان کے نئے معنوی مدار

سے نکال کر خود اپنے نظام کے تحت مصروفِ عمل نے سمعنوی مدار میں داخل نہیں کر دیتی۔"

اختر حسین جعفری نے اپنے جذبوں کی صداقت، احساس کی شدت اور رنگینیٔ افکار کو شعری زبان کے جن پیکروں میں اُتارنے کی تمنا کی، اُس کا اظہار "آئینہ خانہ" میں یوں نظر آتا ہے:

اُٹھائیں فرشِ سماعت سے لفظ لفظ کی خشت
صدا کے خشک سمندر کو چھان کر دیکھیں
کہاں ہے جوہرِ صورت، کہاں زرِ معنی
جگائیں حرف کو خوابِ سفر سے اور پوچھیں
کہاں وہ قصر ہے جس کے کھلے دریچے سے
دکھائی دیتا ہے مفہوم کا نیا چہرہ
اُڑائیں فکر کے باغوں سے تتلیوں سے پرے
پروں نے جن کے چھپالی ہے اصلِ اندیشہ
وہ روشنائی، وہ خوشبوئے غم کشید کریں
مشامِ جاں نے جو قرطاس پر نہیں دیکھی

اختر حسین جعفری نے اظہار و بیان کے لئے جو اُسلوب اختیار کیا وہ ہر اعتبار سے منفرد اور مختلف نظر آتا ہے۔ اُن کے حسنِ بیان میں لفظ لفظ نہیں رہتے بلکہ نگینے کی طرح انگوٹھی میں جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خود اپنے ہی فن کے بارے میں اُن کا اندازِ بیان ملاحظہ کیجئے:

یہ صبحِ حشر بھی میری ہے، پرسشیں بھی مری
شفاعتیں بھی خود اپنے ہنر سے مانگتا ہوں
اُٹھا رہا ہوں زمیں سے دو نیم حرف کا چاند
دکھا رہا ہوں وہ انگشتِ معجزہ جس پر
کہیں ہے مہر ستارہ، کہیں خطِ تنسیخ
چھپا رہا ہوں تہِ سنگ استخوانِ صدا
چھپا رہا ہوں وہ مقتل جہاں پہ لفظوں نے
فراقِ حسنِ تمنا میں خودکشی کر لی
وہ تعبتیں بھی ہیں فردِ حساب میں موجود
کہ جن کا زیورِ غم میں نے خود اتار لیا
سکوت چھین لیا ہے کہ خود کلام کروں

مجھے فخر کا احساس ہوتا ہے جب میں سوچتا ہوں کہ اختر حسین جعفری کی تخلیق "آئینہ خانہ" میں دو ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو میری درخواست پر اُنہوں نے ریڈیو پاکستان کے لئے لکھی تھیں۔ ایک نظم کا عنوان ہے "امتناع کا مہینہ" اور دوسری نظم قائداعظمؒ کے حوالے سے لکھی گئی جس کا عنوان ہے "وہ جو تجھ سے پہلے کی راہ تھی"۔

اختر حسین جعفری ایک پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔

کوئی محفل، کوئی بزم اُن کے بغیر سجتی نہ تھی، وہ "جلال و جمال" کا حسین امتزاج تھے۔ وہ سراپا خلوص تھے۔ عجز و انکساری، دوست نوازی، رواداری اور غریب پروری اُن کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے۔ دوست دشمن اُن کے اخلاص کا دم بھرتے تھے۔ اُن کے فن کا کمال اور فکر کا اعجاز دیکھ کر ہماری نئی نسل اُن کے نقشِ قدم پر چل نکلی ہے۔ نئی نسل کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کے مستند اور قد آور شاعروں کو بھی اختر حسین جعفری کی شاعری نے نئی تحریک بخشی ہے۔

اختر حسین جعفری نے غزل کے لہجے میں تکنیک اور ہیئت کے جو نئے تجربے اُردو نظم میں کئے ہیں وہ انہی کا حصہ ہیں۔ اُنہوں نے اپنے افکار کی رنگینی سے اردو نظم کا دامن مالا مال کر دیا ہے۔ اختر حسین جعفری کی شاعری اور فن آج ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ اُن کا نام دنیائے ادب میں ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا۔

ناہید قاسمی

اُردو نظم کی دنیا میں ایک الگ سے پہچانے جانے والی آواز

ناہید کی شاداب نظموں کا مجموعہ

بجز دل سیراب کرو

نامور نقاد پروفیسر فتح محمد ملک کے دیباچے کے ساتھ

شائع ہو گیا ہے قیمت: ۱۲۰ روپے

اس میں جدید تر اُردو نظم کے پاکیزہ معیاروں کی بھرپور نمائندگی ہوئی ہے

مکتبۂ فنون۔ ۶/۳۹ ملک چیمبرز، لوئر مال۔ لاہور

التحریر۔ کبیر سٹریٹ۔ اُردو بازار۔ لاہور

ڈھانپ دو لوح و قلم

شکیل اختر

میدانِ کرب میں حضرت امام حسین علیہ السلام جب سب کچھ راہِ خدا میں قربان کر چکے تو انہوں نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر اپنے چاروں جانب ایک صدا بلند کی تھی "کوئی ہے جو میری مدد کو آئے ؟" یقیناً اس آواز کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ امام مظلوم اپنی زندگی بچانے کے لئے مدد مانگ رہے ہوں ..... یہ صدا ایک دستورِ حیات تھی، یہ صدا مظلوموں کے لئے ضابطۂ عمل تھی، یہ صدا ہر دور میں آنے والے جابروں کے خلاف احتجاج تھی اور مظلوموں کے لئے بقا کا راستہ ..... اختر حسین جعفری بھی اسی صدا پر لبیک کہنے والے اور اسی بقا کے راستے پر چلنے والے ایک فرد تھے ..... ان کہ تمام شاعری اسی ایک نکتہ کے گرد گھومتی ہے۔ ان کی نظموں میں اسی صدا کی دھمک محسوس ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آمرِ جابر اور ظلم و بربریت کے علمدار ان سے اس لئے خائف رہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جعفری کے کلام کی بے باکی اور حق گوئی کا دریا انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے :

بسترِ سجادوں پہ بیٹھی بیبیو !
اب کسی اجڈے زندانِ ستم کھسکتے نہیں
اب سمیٹو مشک و عنبر، ڈھانپ دو لوح و قلم
آنگ پونچھو اور دائیں نوکِ پا تک کھینچ لو
کچی آنکھوں سے جنازے دیکھنا اچھا نہیں

اور یہ بات میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ وہ "آئینہ خانہ" جسے اختر حسین جعفری نے شہرِ ناقدراں کے لیے افلاک ستارے ہوتے ہوئے بھی آباد رکھا، اُس میں ان کا عکس رہتی دنیا تک روشن سے روشن تر ہوتا جائے گا۔ اس لئے کہ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور اختر حسین جعفری نے بھی کبھی جھوٹ نہیں لکھا۔ اُن کی شاعری میں "آئینہ" ایک بنیادی محرک کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ وہ اس آئینہ پر پُرکاری نہیں کرتے بلکہ اپنے معاشرے کو اس کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں اور لوگ جب اپنی اصل شکل اس آئینے میں دیکھتے ہیں تو ان کے چہرے اُترنے لگتے ہیں اور غرور و نخوت کے گھمبیر اندھیرے آہستہ آہستہ اُن کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرنے لگتے ہیں۔ یہ اعجاز ہے اختر حسین جعفری کے قلم کا :

سرِ نگاہ وہی عکس آئینہ خانہ
وہی ہجومِ مقید، وہی خطِ پرکار
وہی پناہ کا جنگل، وہی سگِ عاسور
اک اور شورِ قیامت نہ بند قہر کھلے
اک اور ضرب کہ تمثال دار آئینہ
تمام عکس بکھر جائے، فنا کر دے

اختر حسین جعفری ایک دیانت دار فنکار تھے۔ ان کے جسم میں گزشتہ نسلوں سے ملنے والی امانت کی حفاظت کا جذبہ لہو بن کر رواں رہتا تھا۔ انہوں نے مشقتوں، مشقتوں اور کاسر لیسی جیسے لفظوں کے جنازے خود اپنے کندھوں پر اٹھائے اور اپنی آئندہ نسلوں کو ایسی بنیاد فراہم کی کہ جب بھی ان بنیادوں پر عمارت تعمیر کی جائے گی وہ ظلم و جبر کے خلاف ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوگی :

سوال بچوں نے جو کئے تھے
جواب ان کا وہی زباں سے وہی دیا ہے جو نجد کو اجداد سے ملا تھا
وہی پرانے سوال اس کے
زمیں اگر خام ہے تو اس پر ہمارے پختہ مکان کیوں ہیں
اگر گلابوں کو رنگ خورشید سے ملا ہے
تو دھوپ کا حسن کون سے پھول کی عطا ہے
وہی پرانے سوال اس کے

کسی بڑے آدمی نے کہا ہے کہ مورخ کسی واقعے کے محرکات اور بعد کے اثرات تو بتا سکتا ہے لیکن واقعے کی اصل روح تک صرف شاعر ہی پہنچ سکتا ہے۔ اگر کہیں آگ لگی ہے تو مورخ آگ لگنے کی وجوہات اور محرکات امتداد سے بتا سکتا ہے لیکن اس آگ کی تپش، جذبوں میں سلگتی ہوئی چنگاری اور احساسات پر لمحہ لمحہ پڑتے ہوئے پھپھولے صرف اور صرف شاعر ہی دیکھ سکتا ہے اور اختر حسین جعفری کی ساری زندگی اور ساری شاعری اسی عمل کا حصہ ہے۔ انہوں نے ہر واقعہ کے اثرات کو اس طرح لفظوں میں منتقل کیا کہ ہر مظلوم، ہر غریب اور ظلم و جبر کی چکی میں پسنے والا ہر فرد اس میں اپنی بقا کا راستہ تلاش کر سکتا ہے —— اختر حسین جعفری کبھی مر نہیں سکتے۔ کبھی مٹ نہیں سکتے۔ اس لئے کہ جب تک ظلم رہے گا، ناانصافی رہے گی، لوگوں کے حقوق غصب ہوتے رہیں گے تو لوگ اختر حسین جعفری کو یاد کریں گے۔ ہاں اختر حسین جعفری اگر مرے تو اس کی وجہ ان کی حق گوئی ۔ بیباکی نہیں ہوگی اور نہ ہی ان کی شاعری ان کو نظر انداز کرنے کا ذریعہ بنے گی بلکہ میں بڑی جسارت سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اختر حسین جعفری مرے تو اس میں کسی اور کا ہاتھ نہیں ہوگا بلکہ ان کے اپنے ہی قبیلے کے لوگ —— شاعر ادیب اور دوست ہی —— اس کے ذمہ دار ہوں گے۔

خون، پسینہ، آنسوؤں، محبتوں اور مشقتوں کے نام

نقاش کاظمی کا

دوسرا مجموعۂ کلام

رُخِ سیماب

شائع ہوگیا ہے

تعارف - فیض احمد فیض ٭ سرورق - اقبال مہدی

ملنے کا پتہ :- ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ مین اردو بازار کراچی

عارف شفیق کی فکر انگیز انقلابی شاعری کا انتخاب

میں ہواؤں کا رُخ بدل دوں گا

پوچھتے ہیں لوگ مجھ سے کیوں مرا نام و نسب
سوچ لیں پیغمبروں سے سلسلہ مل جائے گا

شائع ہوگیا ہے

تقسیم کار :-
ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ مین اردو بازار کراچی۔
فون: ۲۱۸۰۱۶ ، ۲۱۸۰۸۶

شعیب ۲۶ فریدی

اختر حسین جعفری کے لئے ایک نظم

خیال افروز بات سب کے لبوں پہ آکر تھمی ہوئی ہے
لطیف لہجوں پہ کسر کی تہمہ جمی ہوئی ہے
پھٹے ہوئے بادباں کا نوحہ
ہوا میں سسکی رُکی ہوئی ہے
دھنک کا رنگیں مکالمہ اب سمجھنا دشوار ہوگیا ہے
زماں کے گنبد میں پھیلی
دھیمی فریکوینسی کی تیز لہروں کو سن کے
لبیک کہنے والا کوئی نہیں ہے
تو کون اب ترجمان ہوگا؟
کثیف شیشوں کے بادبانوں میں کون دیکھے گا
اور پھر حرفِ ناشنیدہ کی گہری سلوٹ پہ مرتسم
دور کے جزیروں، مسافتوں کے عمیق لہجے
حروفِ نورِ شفق سے کہہ دو، خیالِ تازہ کو اب نہ برتیں
وہ ایک لمحہ کہ جس میں اذنِ کلام ملنا تھا ایشیا کو، گزر چکا ہے
سمیٹ لو یہ تمام باقی حقیر لمحے
زمیں سے مکتوب بھیجنے والے ہاتھ شل ہیں

زمان پر منتشر زمینی مکالموں کی تمام کڑیاں اُلجھ گئی ہیں
صریرِ خامہ کی ریشمی ڈور تاگا تاگا بکھر گئی ہے
حسین اصوات کا وہ ریشم کہاں، نہ جانے، اُلجھ گیا ہے
یہ کھردری اُنگلیوں کی پوریں تو ریشمی صنعتوں سے ناآشنا ہیں گی
خیال افروز بات سب کے لبوں پہ یونہی رُکی رہے گی
حروفِ نورِ شفق سے کہہ دو، خیالِ تازہ کو اب نہ برتیں

۳ شم میرزا

اختر حسین جعفری کی یاد میں

خبر جو آئی —
کہ زندگی کے حسین ماتھے پہ جگمگاتا ہوا
جو جھومر تھا — کھو گیا ہے
خبر جو آئی —
کہ نغمگی جو حریمِ دل میں
نئی اُمنگوں کی کونپلوں کو سنوارتی تھی
وہ کھو گئی ہے
وہ روشنی جو
گلاب چہرے کی نکہتوں کو
بہارِ تازہ بنا رہی تھی
وہ کھو گئی ہے
خبر جو آئی —
کہ اپنے دامن کی وسعتوں کو سمیٹ کر
وقت کی طنابوں کو کاٹ کر
بے قرار لمحوں کی کیاریوں میں
جو فصلِ حزن و ملال بو کر
ہوا ہے رخصت
تو میں نے اختر حسین کی
نیک نامیوں کے مہکتے پھولوں کو
چار سو محوِ رقص پایا
خلوص و مہر و وفا کی شمعیں جلانے والا
گزرتے لمحوں کی دسترس سے
چھڑا کے دامن
وہ امن کے چاند کے تعاقب میں
ہم سے آگے نکل گیا ہے
تو اپنے اندر کے سوگ سے میں نڈھال ہو کر
یہ سوچتا ہوں
بچھڑنے والے کی کس ادا کو
بھلا سکوں گا !!

آصف ہمایوں

آبِ نیلمیں میں شب

اختر حسین جعفری کی یاد میں

زمیں زادے
فلک کو اوڑھ کر گھر سے نکلنا ہے
کہ زیرِ خاک بھی ہیں چاند، سُورج اور ستارے منتظر تیرے
دیارِ خوب تر میں رقص کو آغاز کرنا ہے
ذرا جلدی چلو گھر سے
کہ آبِ نیلمیں میں شب اُترتی آ رہی ہے
اور گرایا جا چکا ہے دید کا سنگِ گراں بھی
اب اُٹھائے جا چکے ہیں بادباں لمبے سفر کے
اور ابھی
شاخوں کی مُٹھی میں بہت سی مشعلیں ہیں، خوشبوئیں ہیں
جو کنارِ بادرکھی ہیں
گُلِ تر کا لباسِ منتظر پہنو
کہ باہر دوست اور احباب سارے آ چکے ہیں
اور ستارہ شام کا پھر بادلوں کی اوٹ میں ہے ——

دھوپ اور بارش

اختر حسین جعفری کی یاد میں

آسماں کے نیلمیں فانوس میں سُورج جڑا ہے
اور مسافر اپنے گھر سے چل پڑا ہے
اور یہ کیسی آنکھ ہے اب جس کے نم میں بے بسی ہے
اور لہو کا سُرخ پتھر جل رہا ہے

ذوالفقار انجم

سکوتِ گریاں

برادرِ محترم قبلہ اختر حسین جعفری اعلیٰ اللہ مقامہ کی یاد میں

ڈوبی ہوئی ہے غم میں زمیں، آسماں اُداس
سب محفلِ حیات کی رنگینیاں اُداس
چہرے پہ چاند کے غمِ ہجراں کی زردیاں
تارے تمام سوگ میں ہیں، کہکشاں اُداس
یہ کون اُٹھ گیا کہ ہے ویران انجمن
یہ کون چل بسا کہ ہے سارا جہاں اُداس

شعروں کی بزم کا ہمکشانی تجھی سے تھی
لفظوں میں شش جہاتِ معانی تجھی سے تھی
اختر حسین جعفری — اے کائناتِ نظم!
یہ بزمِ کائنات سہانی تجھی سے تھی
سطروں میں تیری فکر کے نافے کھُلے ہوئے
لوحِ ادب پہ مُشک فشانی تجھی سے تھی
لہجے کی نرم رَو تھی کہ مُڑتی ہوئی ندی
لفظوں کی آبجُو میں روانی تجھی سے تھی
اے شہر یارِ ملکِ تخیّل! کہاں ہے تُو؟
اے نظم کے عظیم تموّل! کہاں ہے تُو؟

اب زندگی ہے حشر بداماں ترے بغیر
تارِ نفس ہے خنجرِ عُریاں ترے بغیر
کب تک سُنائی دے نہ سکے گی تری صدا
کب تک رہے گا دید کا ارماں ترے بغیر
کب تک رہے گا ماتمِ یک شہرِ آرزو
کب تک رہے گی شامِ غریباں ترے بغیر
نوحہ کناں ہیں حرف و معانی کی بستیاں
ماتم کدہ ہے شہرِ ادیباں ترے بغیر
تہذیبِ شعر خاک بسر دیکھتا ہوں میں
بزمِ سخن ہے کلبۂ احزاں ترے بغیر
تُو نے بُنا جو ریشمی لفظوں کے تار سے
ہونے لگا ہے چاک وہ داماں ترے بغیر

اُسلوب نو کے موجد و خاتم! تجھے سلام
چرخِ سخن کے نیّرِ اعظم! تجھے سلام

محمد مشتاق آتش

اختر حسین جعفری کیلئے ایک نظم

اِمتناع کا مہینہ تو آیا نہیں
چل دیئے آب و گل کا جہاں چھوڑ کر
شعرِ اقلیم کا کارواں چھوڑ کر
تم تو کہتے تھے، میں ماہِ عاشور میں
"فرشِ ہموار پر بھی تو چلتا نہیں
دل دھڑکتا نہیں
اس مہینے میں گھر سے نکلتا نہیں"
قول کو فعل سے تم نے سچ کر دیا
اِمتناع کے مہینے کی آمد سے پہلے ہی تم
آنکھ کی وسعتوں سے پرے جا بسے
تم جُدا ہم سے کچھ ایسی رُت میں ہوئے
سب درختوں نے ہے چادرِ سبز اوڑھی ہوئی
سارے گلشن پہ جوبن ہے آیا ہوا
کیسے موسم میں ساجن پرایا ہوا!

سجاد مرزا

اختر حسین جعفری کیلئے ایک نظم

عجلتوں کا پیامبر تھا
گھٹن کے صحرا سے وہ نکل کر
بہار وادی میں آگیا تھا
وہ اپنے لہجے کی نغمگی سے
عروسِ نظمِ جدید لایا
نہ جانے کتنے ہی منظروں سے
حریمِ شعر و سخن سجایا
حصارِ ظلمت میں رہنے والوں کو
اک نیا رنگ، ڈھنگ بخشا
دبنگ لہجے میں بات کرنا
اسی نے ہم کو سکھا دیا ہے!
وہ جبر کو آئینہ دکھا کر
فضا میں پرواز کر گیا ہے
ہر ایک محفل کی ہے وہ رونق
یہ کون کہتا ہے، مر گیا ہے!
سُلگتے زخموں پہ رکھ کے مرہم
محبتوں کا پیام دے کر
اور اپنے سینے میں ٹیس لے کر
خزاں رسیدہ چمن میں ہنس کر
ہمیں وہ جینا سکھا گیا ہے!

علی اصغر عباس

اختر حسین جعفری کیلئے

دن کو زنداں میں کس نے ڈال دیا؟
شام کے ملگجی سراپے پر
شب کی تلوار کیوں لٹکتی ہے؟
نارسائی کا خوف کیسا ہے؟

سوچ، جنگل، فقیر کی کٹیا
ایک روشن الاؤ نقطوں کا
سطر در سطر نظم کی صورت
رُخِ قرطاس پر بکھرتا ہے

حیرتوں کا کمال ہے یہ بھی
التجائے کی ذات سے کٹ کر
حرفِ زندہ حیات کھو بیٹھا
اک ستارہ شناس رو بیٹھا

پانیوں پر روانیاں لکھ کر
عکسِ پارہ بھی بے ثبات ہوا
راز، ہمرازِ کائنات ہوا

سیّد صفدر حسین جعفری

اختر حسین جعفری کے نام

تم عصرِ نو کے آئنہ خانے میں فرد تھے
وہ نظم گو تھے تم، کہ زمانے میں فرد تھے
معلوم تھا تمہیں کہ اُکھڑ جائے گی یہ بزم
برہم جو ہوگی، اور اُجڑ جائے گی یہ بزم
ہم سے بچھڑ کے تم نے کچھ اچھا نہیں کیا!
اس عہدِ بے لباس میں تم خوش لباس تھے
اس عہدِ بے اساس میں تم خوش اساس تھے
اب تم نہیں تو صورتِ آیام اور ہے
دل میں ہمارے حسرتِ الہام اور ہے
آنکھوں میں آنسوؤں کے سمندر ہیں موجزن
اے ضبطِ گریہ! جا، کہ ہمیں کام اور ہے

اختر شناس! قریۂ سیارگاں سے پوچھ
شمس و قمر میں جا، دلِ آزادگاں سے پوچھ
اختر کہاں گیا ہے ہمارے مدار سے
اغماض ہے یہ کیسا ہماری پکار سے!

ذمان کنجاھی

لطیف ساحل

اختر حسین جعفری کے نام

آئینہ خانے کی صورت اک نشانی دے گیا
زندگی کو نُدرتِ حسنِ معانی دے گیا
جلتے جاتے، جانے والا آج تحفے میں ہمیں
کچھ نئے غم اور کچھ یادیں پُرانی دے گیا
نظم گوئی سے تھی رنگیں زندگی اُس شخص کی
روشن و زندہ رہے گی شاعری اُس شخص کی

اختر حسین جعفری کی یاد میں

اک شخص، زمیں پر بکھرا تو تحریر ہُوا
اک شیشہ تھا جو ٹوٹا تو تصویر ہُوا

اک شام نے پایا نور، شفق کی لالی سے
اک سُورج بُجھتے بُجھتے بھی تنویر ہُوا

تھوڑی سی ملاقاتوں میں صدیاں قید ہوئیں
اُس قرب کا ہر اک لمحہ، اک زنجیر ہُوا

غافر شہزاد

بس اک لمحے کی سازش نے

اختر حسین جعفری کیلئے

گھرا ہوں آبشاروں میں
عجب خوں رنگ بارش ہے
دھنک کو کیا ہوا ، اس نے سبھی رنگوں کو چھوڑا
اور میری آنکھ کی پُتلی میں خوں بن کر اُتر آئی
بہت دن ہو گئے ہیں چاندنی گھر میں نہیں اُتری
"جہاں دریا اترتے تھے" وہاں صحرا نے کر لی ہے
رہائش اختیار اب کے
میں آدھی رات کا سُورج ہوں
میری پُشت پر کرنوں کی بارش ہے
مرے پاؤں میں ان دیکھے جزیروں میں اُتر جانے کی
خواہش ہے
"سرشکِ خوں رُخِ مضموں پہ چلتا ہے تو اک رستہ نکلتا ہے"
میں اس رستے پہ چلتا ہوں
مگر ہر ایک سنگِ میل پر زیرو رقم ہے

فاصلے فٹ پاتھ پر بیٹھے کبوتر ہیں
پروں کو کھول بھی دیں تو
بدن اُٹھتا نہیں ان سے —— سفر کٹتا نہیں ان سے
مگر اک شخص ان رستوں سے گزرا ہے
کہ سُورج اس کی پیشانی پہ روشن تھا
غروب اس کو بھی ہونا تھا
بھری دوپہر کو اس نے زمیں آکاش کے باہم
گلے ملتے کناروں کو شفق آلود کر ڈالا
ازل سے وہ جو لفظوں کا پجاری تھا
بس اک لمحے کی سازش نے اُسے معبود کر ڈالا

غافر شہزاد

آؤ ماتم کریں

اختر حسین جعفری کیلئے

کس نے لکھی ہے تفسیر اس درد کی ؟
کون ہے جس نے چکھا نہیں ذائقہ
پاؤں سے ہیں بندھی بے ثمر ساعتیں
راستے وقت ہیں
تم چلو یا رکو — ان کو مطلب نہیں
ہاں کناروں پہ جو ایستادہ ہیں اشجار
سب دیکھتے ہیں
"کہاں کس کے پاؤں پڑے رہ گئے
گھر سے کس کوس نکلا تھا کوئی
مگر وقت اس کو کہاں پر بہا لے گیا"
پاؤں زنجیر ہوں ، آنکھ میں اشک جم جائیں تو
وقت تھم جاتا ہے
ہاں مگر راستے یونہی لاحاصلی کے سمندر کی جانب
سفر کرتے ہیں
آؤ ۔ زنجیر پا توڑ دیں
آنکھ میں اشک جمنے نہ دیں
وقت تھمنے نہ دیں

جمشید چشتی

نذر اختر حسین جعفری

ہوئی ہیں تجھ پہ جو نازل ، وہ آیتیں دیکھوں
میں تیرے "آئینہ خانے"[1] کی صورتیں دیکھوں

ہر ایک لفظ ہے معنی کا بے کراں ساگر
ہر ایک حرف میں صحرا کی وسعتیں دیکھوں

طلسم یہ ترے گلزارِ نظم کا ہے کہ میں
گلوں کے رنگ سنوں اور نکہتیں دیکھوں

میں تیرا کچھ بھی نہیں ہوں ، مگر میں تیرا ہوں
رخِ ندیم[2] پہ جب تیری چاہتیں دیکھوں!

---

[1] "آئینہ خانہ" جعفری صاحب کا مجموعۂ کلام

[2] جعفری صاحب سے میری کلامی روحانی وابستگی ندیم صاحب کی مرہونِ منت ہے۔

منظر حسین اختر

کتبہ

(والدِ محترم جناب اختر حسین جعفری مرحوم کے لئے نظم)

کس قیامت سے گزر آیا ہوں
یہ کوئی خواب ہے یا دشتِ حقیقت کوئی
دشت و صحرا میں کوئی مجھ سے زیادہ نہ اکیلا ہوگا
دربدر خاک بسر ہے ہر اک امید کا قیس
سرِ محمل کسی امید کی لیلیٰ بھی نہیں
یہ کوئی خواب ہے یا دشتِ حقیقت کوئی
کس قیامت سے گزر آیا ہوں

خاک کو اوڑھ لیا کیوں تُو نے
زندگی گورِ جدائی کا اندھیرا کر دی
یہ جدائی مرا مرقد بھی نہیں
ورقِ گل پہ مرا نقش تری قبر کا کتبہ ٹھہرا

مضطرب آنکھ میں کس رنگ کی لو روشن ہے
ناامیدی کے خیام آج سرِ دجلۂ خوں آن لگے

نہ کہیں وصل کا پانی، نہ کہیں ہجر کی خنکی
ہجر کے طاق میں روشن ہے فقط کرب کی لَو

کس قیامت سے گزر آیا ہوں
کوئی کیا جان سکے گا، تجھے کس دل سے کیا میں نے وداع
کیوں تجھے روک نہ پایا دلِ لاچار مرا
میرے اشکوں کی طرح سُوکھ گئے گور پہ گُل
آج آنکھوں کی طرح میری زمیں بنجر ہے
وقت سینے سے گزرتا ہے کسی ہل کی طرح
یہ مرا دل ہے کہ صحرائے محبت کوئی
آج اس دل میں کسی پھول کا امکان نہیں
وقت سینے سے گزرتا ہے کسی ہل کی طرح
کس قیامت سے گزر آیا ہوں
کوئی پوچھے تو بتانا بھی نہیں ممکن ہے
کس قیامت سے گزر کر ترے پاس آیا ہوں

منظر حسین اختر

ستارا ابھی کہکشاں میں گھرا ہے

(والدہ مرحوم کے لئے ایک نظم)

ستارا ابھی کہکشاں میں گھرا ہے
ابھی راکھ میں ایک شعلہ دبا ہے
ابھی ایک چہرہ صدا دے رہا ہے

ابھی وادیوں میں گُل حرف پر رنگ اترا نہیں ہے
سرِ آرزو کوئی وعدہ نہیں ہے
سرِ دل محبت کی دستک نہیں ہے

مگر چاہتوں کا خیامِ خمیدہ نم آلود آنکھوں کنارے کھڑا ہے
نم آلود آنکھو! مرے آنسوؤں کے لیے چادرِ خیمہ رومال کیوں ہو
کہ اک مہرباں ہاتھ کا لمس گالوں کو رومال ہے
ایک لمحے کو رُک، دیکھ جاناں!
مری جاں! مرے دل کی چوکھٹ تک آجا
کہ میں آنسوؤں میں تجھے قید کر لوں
ابھی میں جُدائی کا عادی نہیں ہوں

ستارا ابھی کہکشاں میں گھرا ہے
ابھی میں جدائی کا عادی نہیں ہوں

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

اختر حسین جعفری | چند یادیں، چند تاثرات

ایوب ندیم

اختر حسین جعفری ہم سے بچھڑ گئے مگر اتنی خاموشی کے ساتھ کہ نہ تو جنگل کو آگ لگی، نہ زلزلہ آیا اور نہ ہی کوئی طوفان اٹھا۔ مجھے لگا جیسے پھول سجانے والا انسان اور خوشبوئیں بکھیرنے والا شاعر مر گیا، اتنا بڑا سانحہ ہو گیا مگر اُن مظاہر فطرت کو کچھ بھی نہ ہوا جن سے وہ محبت کرتا تھا۔ ہاں! اُس کی موت سے اس کے دوستوں اور چاہنے والوں کے دلوں میں ایسا طوفان برپا ہوا کہ مسرتوں کی عمارتیں منہدم ہو گئیں اور ایسا سیلاب آیا کہ خوشیوں کے گلہواروں کو خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ اُن کے جس چاہنے والے کو جس لمحہ اُن کی موت کے سانحے کا علم ہوا وہ وہیں آئینہ سا صورت دیوار ہو گیا۔ ایک مقیدت مند کی حیثیت سے مجھے خود بھی ہم جون کے اخبار میں شائع شدہ اُن کی موت کی خبر پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے کافی دیر مزاحمت کے بعد آخر کار اُن کی وفات کی اطلاع کو اس لئے تسلیم کر لیا کہ اُن کے گھر والوں نے خود اس کی تصدیق کر دی تھی۔

اختر حسین جعفری ایک بڑے شاعر بھی تھے ——— اور بڑے انسان بھی ——— اور اُن کی یہ دونوں قدآور حیثیتیں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ وہ ایک دبلے پتلے انسان تھے۔ اُن کا چہرہ ہمیشہ بشاش بشاش رہتا تھا۔ مسکراہٹ اُن کے چہرے کا ایک لازمی حصہ تھی۔ اور مستقل مزاجی اُن کی شخصیت کا ایک ناگزیر جزو ——— انہوں نے جس سے دوستی کی، عمر بھر کی اور زندگی گزارنے کے جو اصول بنائے ان پر ہمیشہ کاربند رہے۔ وہ ایک بڑے شاعر ہونے کے باوجود اپنے گھر اور ملازمت کو پورا وقت دیتے تھے گویا انہوں نے اپنی تمام ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھائیں۔

اختر حسین جعفری سے میری خاموش شناسائی پاک ٹی ہاؤس میں اسرار زیدی کی مخصوص ٹیبل سے شروع ہوئی۔ وہ جب بھی وہاں آتے اسی ٹیبل کے قریب بیٹھتے۔ میرے سلام کا جواب اس قدر اپنائیت سے دیتے۔ جیسے وہ میرے برسوں کے شناسا ہیں۔ اُن سے میرا پہلا تعارف بھی اسی جگہ اسرار زیدی کی معرفت ہوا مگر اُن سے میری پہلی تفصیلی ملاقات قائم نقوی کے دفتر میں ہوئی اور یوں گفت و شنید کا یہ سلسلہ ٹی ہاؤس سے اُن کی رہائش گاہ کے ڈرائنگ روم تک پھیل گیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ تبادلہ خیالات اس قدر طویل ہو جاتا کہ ٹی ہاؤس کا وقت ختم ہو جاتا اور یوں میں اُن کے ہمراہ اُن کے گھر تک چلا جاتا۔ راستے میں بھی باتیں ہوتی رہتیں اور گھر پہنچ کر بھی ——— اُن کے ڈرائنگ روم کی سب سے نمایاں تصویر میں وہ احمد ندیم قاسمی کے ساتھ بغلگیر تھے اور یہ بات محض تصویر تک محدود نہ تھی۔ وہ ہمیشہ ندیم کے ساتھ اپنی چالیس سالہ دوستی پر ناز کرتے تھے ——— وہ وعدے کے بڑے پکے تھے۔ مجھے جب بھی وقت دیا، گھر پر موجود رہے اور اگر کبھی میں بغیر اطلاع کے بے وقت بھی انہیں ملنے گیا تو انہوں نے اپنے چہرے کی دلکش مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ صرف دو بار ایسا ہوا کہ انہیں وعدہ کے مطابق وقت پر پہنچنے میں تاخیر ہوئی۔ ایک بار جب میں اُن کی تاخیر کے باعث ٹی ہاؤس واپس چلا آیا

تو میرے پہنچنے سے پہلے اسرار زیدی کو اُن کا فون پہنچ گیا جس میں انہوں نے مجھ سے معذرت کی تھی۔ اور دوسری بار اُن کی تاخیر کے باعث میں نے اُن کے ڈرائنگ روم میں ان کا انتظار شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئے اور سیدھے ڈرائنگ روم پہنچے اور مجھے بتایا کہ وہ اپنے دفتر کے

نئی نظم چھوڑ کر آگئے ہیں۔ ان کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ مسکرا رہے تھے اور ان کی گفتگو سے خوشبو پھیل رہی تھی۔ میں سوچتا ہوں ایسا وعدے کا پکا اور اخلاقی قدروں کا پاسدار اب کہاں ملے گا جو اپنے کسی عمل اور بات سے دوستوں کا تو کیا دشمنوں کا دل بھی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

ان کی موت سے کوئی دو ماہ قبل میں نے اپنا ایک تنقیدی اور تحقیقی مضمون "جدید اردو نظم۔ فکر اور طرزِ احساس" مکمل کیا اور اس کی تکمیل کا ذکر اختر حسین جعفری سے کیا۔ انہوں نے مضمون دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے مضمون اُن کے حوالے کر دیا جو کوئی ایک ماہ اُن کے پاس رہا۔ اپنی موت سے کوئی بیس روز قبل انہوں نے مضمون میرے حوالے کیا جس کی بعض سطور انہوں نے نشان زد کر رکھی تھیں۔ میں نے وجہ دریافت کی تو کہنے لگے "آپ کی ان آرا سے مجھے اختلاف ہے۔ آپ مضمون ایک بار پھر پڑھ لیں اس کے بعد ان نکات پر بات ہوگی" چند روز بعد شام کے وقت اُن کا فون آیا کہ اگر آنا چاہو تو آجاؤ۔ خالد احمد اور نجیب احمد بھی بیٹھے ہوئے ہیں آپ کے مضمون پر بھی بات ہوگی مگر میں ایک ضروری کام کے باعث نہ جا سکا۔ میں سمجھتا تھا ابھی بہت وقت ہے۔ جعفری صاحب سے دُھیروں ملاقاتیں ہوں گی مگر اب اس بات کا پچھتاوا ہے کہ ملاقاتیں ادھوری رہ گئی ہیں اور کئی ضروری باتیں رہ گئی ہیں۔

اختر حسین جعفری ایک بڑے انسان تو تھے ہی، ایک اعلیٰ شاعر بھی تھے۔ اُن کے ساتھ ملاقاتوں میں بعض اوقات ان کے چھوٹے صاحبزادے امیر حسین بھی شریک ہوتے تھے جو اپنے والد کی تصویریں اور انہیں اپنے والد کی شاعری سے بڑی محبت ہے۔ میں نے جعفری صاحب کا آدم جی ادبی انعام یافتہ شعری مجموعہ "آئینہ خانہ" بھی پڑھا۔ اس کے بعد کی نظمیں بھی میرے زیرِ مطالعہ آئیں اور کچھ نظمیں اُن کی زبانی بھی سُنیں جن سے مجموعی تاثر یہی ابھرتا ہے جسے ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے تسلسل، رنگ، برجستگی، روشنیوں سے تعبیر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اردو نظم کی اس تحریک کے نہایت اہم شاعر تھے جس کے سب سے بڑے شاعر ن۔م۔ راشد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بطور شاعر اُن کا تعلق راشد اور فیض دونوں سے جڑا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ ان کی شاعری ایک طرف تو ہمارے کلاسیکی روایتوں کے ساتھ جُڑی ہوئی ہے اور دوسری جانب شاعرانہ اظہار کے نئے پیکر تلاش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ عام طور پر ذاتی نوعیت کے تجربات سے ایک ایسا شاعرانہ انداز اختیار کرتے ہیں جو اردو کی ایک بڑی شعری روایت کا ایک نیا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اختر حسین جعفری کی شاعری کا سب سے بڑا فنی کمال ان کی امیجری ہے اور وہ اس ضمن میں ایذرا پاؤنڈ اور ٹی ایس ایلیٹ سے بڑے متاثر تھے۔ پاؤنڈ تین مصرعوں سے امیج بناتا تھا مگر اختر حسین جعفری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے دو دو تین تین لفظوں سے پیکر تراشی کی ہے۔ اُن کی نظموں میں جبر اور ظلم کا استعارہ تاریخ کا جبر اور ظلم بن کر ظاہر ہوا ہے وہ اپنی شاعری میں تاریخ کے جبر کی نہ صرف نشاندہی کرتے ہیں بلکہ مظلوموں کے ہمنوا بن کر بھی اُبھرتے ہیں۔ اسی طرح ان کی نظموں میں معاشرتی سچائی انسان کی ذات کا حصہ بن کر ظاہر ہوئی ہے۔ وہ بلاشبہ عہدِ حاضر میں جدید نظم کے بڑے شاعر تھے یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ نئی نظم کے معدودے چند قدآور شاعروں میں سے ایک تھے —— ان کی وفات جدید اردو شاعری کا اتنا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی شاید برسوں تک نہ ہو سکے۔

اختر حسین جعفری کا "آئینہ خانہ" تو محفوظ ہے، مگر اُن کی بہت سی نظمیں ابھی کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئیں۔ انہوں نے اپنی آخری ملاقاتوں میں مجھے بتایا کہ اُن کا دوسرا شعری مجموعہ زیرِ ترتیب ہے اور وہ اسی سال شائع ہو جائے گا —— میری اُن کے دونوں صاحبزادوں سے درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد اس مجموعے کی اشاعت کا اہتمام کریں تاکہ تشنگانِ نظم اُن کی عمدہ شاعری سے اپنی پیاس بجھا سکیں اور ان کے شاعرانہ مرتبے کو ادب کی بلندی پر محسوس کر سکیں۔ اپنی وفات سے چند روز قبل انہوں نے میرے کالج کے علمی و ادبی مجلّہ "القلم" کے لیے مجھے اپنی نظم "سخن درماندہ ہے" عنایت کی تھی جو فنون" پڑھ چکے ہیں۔

اختر حسین جعفری سے آخری مکالمہ

تنویر ظہور

س: کیا موجودہ ادب عصری شعور کی بھرپور ترجمانی کر رہا ہے؟

ج: اگر عصری شعور سے آپ کی مراد جدید حسیت ہے تو ہمارا شعری ادب اپنی کلیت میں اس کی ترجمانی ایک حد تک ضرور کر رہا ہے۔ تنویر صاحب، عصر خود اپنی ذات میں ایک بے جان علامت ہے۔ زمین اور ورائے زمین موجود زندہ حقیقتیں اس علامت کو زندگی عطا کرتی ہیں۔ انہی خارجی مظاہر سے انسانی تاریخ وجود میں آتی ہے اور انہی مظاہر کی قوت سے ادب تخلیق ہوتا ہے، ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کی فرسودہ تقسیم اب متروک ہو چکی ہے، ادب اپنی جدید تعریف کے اعتبار سے جملہ داخلی اور خارجی انسانی مسائل کے ہنرمندانہ اظہار کا نام ہے، اس پس منظر میں ہمارا ادب ایک حد تک ہمارے عصر" کی نمائندگی کر رہا ہے۔

س: بحیثیت ادیب و شاعر آپ کا نظریۂ فن کیا ہے؟

ج: آغشتہ ایم ہر سر خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

س: جدید اردو نظم کے بانیوں میں راشد اور میراجی کا نام لیا جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں نئی نسل ان دو بڑے شعراء میں سے کس کے زیادہ زیرِ اثر ہے اور پھر یہ کہ خود آپ تخلیقی سطح پر کس کے زیادہ قریب ہیں؟

ج: آزاد تلازمے کی شاعری میں نئی نسل نے راشد کے اثرات زیادہ قبول کئے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ راشد اپنے شعری محاورے میں اردو شاعری کی بڑی روایت سے میراجی کے مقابلے میں زیادہ متصل ہے۔ میراجی کی نظم ہندی گیت کا لحن اور آہنگ رکھتی ہے جب کہ راشد کی نظم کا صوتی نظام فارسی شاعری کے لحن کی خصوصیات رکھتا ہے۔ اردو کی کلاسیکی شعری روایت اپنے عمومی مزاج کے اعتبار سے فارسی شاعری کے اثرات کی بنیاد پر کھڑی ہے چنانچہ نئے شعراء جب راشد کے تخلیقی منطقوں سے گزر کر شعر کہتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو اردو شاعری کی عمومی روایت میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ میرے نزدیک میراجی کے شعری تجربے میں تدریسی قوت بہت کم ہے۔ لیکن اُن کی نثر، بالخصوص اُن کے غیر ملکی ادب کے تراجم بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ میں نے راشد کی "ماورا" آج سے کوئی چوالیس سال پہلے طالب علمی کے ایام میں پڑھی تھی۔ میرے خیال میں یہ کتاب آزاد تلازمے کی شاعری کے حوالے سے نصاب کا درجہ رکھتی ہے۔

س: کہا جاتا ہے کہ بگڑا ہوا غزل گو مرثیہ نگار اور ناکام غزل گو نظم نگار بن جاتا ہے۔ آپ کا نظم نگاری کی طرف جھکاؤ کہیں انہی وجوہ کی بنا پر تو نہیں ہوا؟

ج: بھائی! شعری اظہار کے لئے اصناف تو محض وسیلہ ہوتی ہیں۔ شاعری چاہے غزل میں ہو چاہے نظم میں، اسے شاعری ہونا چاہیئے اور پھر جو شاعر

غزل کہنے میں ناکام ٹھہرے وہ اچھے نظم گو بھی نہ بن سکے۔ اگر غزل کے بگاڑ سے انیس کے سے مرثیہ نگار پیدا ہوتے رہیں تو خدا کرے کہ بگاڑ کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے۔

س: کیا یہ درست ہے کہ جدید نظم، غزل کے مقابلے میں قارئین کا وسیع حلقہ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے؟ اس کا سبب ہیئتی سطح پر نظم کی عدم تفہیم تو نہیں؟

ج: ایک ایسے ملک میں جہاں خواندگی کی فی صد شرح نہ ہونے کے برابر ہو وہاں ادب پڑھنے والوں کا تناسب معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ ادب کے سنجیدہ قارئین کی اس اقلیت میں اکثریت ان قارئین کی ہے جن کے ادبی ذوق کی تربیت میں غزل کی شاعری کا بنیادی دخل ہے۔ اسی سبب سے قارئین کا نظم کی طرف جھکاؤ نسبتاً کم ہے۔ جہاں تک جدید نظم کی تفہیم کا سوال ہے یہ مسئلہ نیا نہیں اور جدید نظم پر عدم تفہیم کا الزام بھی بہت دیر سے چلا آ رہا ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کہ غزل کے مقابلے میں جدید نظم کی تفہیم ایسے قاری کے لیے مشکل ہے جس کے شعری ذوق کی تربیت غزل کے حوالے سے ہوئی ہو۔ عام قاری کی اس ضمن میں مشکلات تو سمجھ میں آتی ہیں لیکن جدید نظم کی عدم تفہیم کی شکایت تو ہمارے کچھ ایسے نامور غزل گو شعرا بھی کرتے ہیں جو تاہنوز انیسویں صدی عیسوی کی "سنسیبلیٹی" میں زندگی گزار رہے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ عام قاری اور عام غزل گو شاعر، جدید نظم کو بھی غزل کے انداز میں پڑھتا ہے اور پھر اس سے اسی نوعیت کی تفہیم کا طلب گار ہوتا ہے جو غزل کے مخصوص SET ہیئتی نظام کے سبب آسانی سے ہاتھ آجاتی ہے۔ یا پھر بقول غالب، مفت ہاتھ آجاتی ہے اس لیے بری نہیں لگتی۔ نظم کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ جدید نظم اپنے کثیر الجہات ہیئتی نظام کے سبب غزل کی نسبت زیادہ انہماک اور جدید سنسیبلیٹی سے پیشگی آگاہی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ادب کا عام قاری اور بعض حالات میں عام پیشہ ور شعرا بھی نظم کی تفہیم کے لیے مطلوبہ فکری شرائط پوری نہیں کر پاتے چنانچہ نئی شاعری اور اس کے قاری کے درمیان مغائرت کی یہ خلیج پُر نہیں ہو رہی۔

س: کچھ نثری نظم کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

ج: نظم آزاد کی طرح نثری نظم کا شعری تجربہ بھی میرے خیال میں یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے نثری نظم کے بہت کم شعرا اپنی نظموں کی ہیئتی تشکیل میں اس صوتی آہنگ کو برقرار رکھنے کا گُر جانتے ہیں جس کی اساس پر نظم کا ڈھانچہ استوار ہونا چاہیے۔ تاہم نثری تلازمے کی شاعری میں بھی ہمارے ہاں اعلیٰ درجے کی شاعری کے نمونے مل جاتے ہیں۔ نثری شاعری کے حوالے سے قمر جمیل، مبارک احمد، انیس ناگی، کشور ناہید، عبدالرشید، افضال احمد سید اور نسرین انجم بھٹی کی بعض نظمیں بہت اہم ہیں۔

س: آپ کو احمد ندیم قاسمی کے گروہ کا فرد سمجھا جاتا ہے۔ کیا آپ اس الزام کو تسلیم کرتے ہیں؟

ج: "گروہ" سے آپ کی مراد کیا ہے؟ یہ لفظ تو ان دنوں اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ لفظ گروہ سے فوراً یہ خیال اُبھرتا ہے کہ ندیم صاحب کسی دہشت پسند تنظیم کے سرغنہ ہیں اور جیسے اس تنظیم کا ممبر ہونا جرم اور اس جرم کو تسلیم کرنا اقبالِ جرم کے مترادف ہے۔ بھائی! ندیم صاحب اس صدی کی سب سے قدآور شخصیات میں سے ایک ہیں۔ ان کا کوئی گروہ نہیں۔ میں تو ان کا دیرینہ ارادت مند ہوں!

ایں قدر جرم ننگِ عفو مباد
ہر چہ کردم دوبار خواہم کرد

س: آپ نے شاعری میں کسی سے باقاعدہ اصلاح لی؟

ج: کسی استاد سے "باقاعدہ" اصلاح کی سعادت تو مجھے حاصل نہیں ہوئی البتہ اپنی نظموں پر "بے قاعدہ" قسم کی اصلاح، جسے رائے کہنا زیادہ مناسب ہوگا، اس کی احتیاج مجھے ہمیشہ رہی ہے۔ اپنی نظموں کی تخلیقی حیثیت پر میں نے ندیم صاحب اور اپنے دوست ضیاء الدین ضیاء

کی رائے کو فیصلے کے طور پر قبول کیا ہے۔

س: بیشتر شعرا میں آپ کس کس شاعر سے متاثر ہیں؟

ج: متاثر ہونے سے اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ میری شاعری میں کس کس بیشتر شاعر کے عزائم اظہار کے آثار ملتے ہیں تو اس بارے میں عرض ہے کہ ایک عہد میں زندہ شعرا یا ہمعصر تخلیق کار، بیشتر یا جزئیہ کی تخصیص سے قطع نظر، ایک دوسرے کو بیک وقت متاثر بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے ایک حد تک متاثر بھی ہوتے ہیں۔ ہمعصر شعری تجربے کی اس فہرست میں ان شعرا کے تجربے کو بھی شامل کر لیں جو وجودی سطح پر تو ہم میں موجود نہیں ہوتے لیکن ان کا تخلیقی تجربہ اپنی عمر لمبی زندگی کے نفس کے سب ہمارے ہمراہ سانس لے رہا ہوتا ہے۔ ان سب تجربات کے اشتمالی عمل سے نئی "سنسیبلیٹی" بنتی ہے —— ایک نئی شعری روایت معرض وجود میں آتی ہے۔

س: سرگودھا سکول کی خدمات آپ کی نظر میں ادبی حوالے سے کیا ہیں؟

ج: یہ سرگودھا سکول یا پھر لاہور سکول کیا چیز ہیں؟ ہمارے تنقید نگار ابھی تک لکھنویت، دہلویت کے مکاتیب فکر کی پرانی تقسیم ادب سے باہر نہیں نکلے۔ سرگودھا میں ہائی سکول تو بہت سے ہوں گے مگر ادبی سکول تا ہنوز قائم نہیں ہوا۔ اسی طرح لاہور میں بھی کہیں لکھنوی یا دہلوی طرز کا ادبی سکول مجھے نظر نہیں آیا۔ البتہ اچھا ادب تخلیق کرنے والے ان ہر دو شہروں میں موجود ہیں۔

س: کیا غزل ایک مضبوط صنفِ شاعری ہے؟

ج: اردو شاعری میں غزل بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ وہ واکر ہے جس کے سہارے ہر شاعر اپنے شعری سفر کا آغاز کرتا ہے۔

س: احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: ندیم صاحب بہت بڑے شاعر، بہت بڑے افسانہ نگار اور بہت بڑے انسان ہیں۔

س: علامہ اقبال کے بعد سب سے بڑا شاعر اور ادیب کون ہے؟

ج: ابھی تو خود علامہ اقبال کی اصل بڑائی کی دریافت کا سلسلہ جاری ہے اور اس کے بعض اہم پہلوؤں پر فنی فیصلوں کا اعلان باقی ہے۔ پہلے ان کا مسئلہ طے ہو تو بات آگے چلے

ع در دشتِ جنونِ او جبریل زبوں صیدے

س: آپ کا نیا مجموعۂ کلام کب تک شائع ہو رہا ہے؟

ج: پھر جمع کرتا ہوں جگر لخت لخت کو
شاید سال رواں کے آخر تک کوئی بندوبست ہو سکے۔

س: آپ نے پہلی نظم کب لکھی اور اس کا عنوان کیا تھا؟

ج: میں نے پہلی نظم ۱۹۴۹ء میں "بلاوے" کے عنوان سے کہی تھی۔

س: کیا آپ کو اپنا کوئی ایسا شعر یاد ہے جس کو سن کر کسی کی زندگی میں انقلاب آ گیا ہو یا آپ نے سننے والے کی آنکھوں میں بھانک کر اس انقلاب کو دیکھا ہو؟

ج: ہر اچھا شعر سامع کو جذباتی سطح پر متاثر کرتا ہے اور اس کے اندرونِ ذات میں ایک خوشگوار قسم کی تبدیلی لانے کا سبب بنتا ہے، مگر یہ انقلاب تو اپنے معنوی پس منظر کے اعتبار سے بہت گرانڈیل قسم کا لفظ ہے۔ میں نے اس نوعیت کا انقلاب اپنے کسی شعر کے حوالے سے اپنے کسی سامع کی آنکھ میں اب تک نہیں دیکھا۔

س: کیا آپ کو علم نجوم سے دلچسپی ہے؟

ج: ؎ وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہیں خوار و زبوں

س: آپ کا بُرج کون سا ہے؟

ج: ابھی کچھ دیر ہے دستِ لہو بستہ پہ پورا اُترنے میں
بہت سے بُرج خالی ہیں

س: آپ کا پسندیدہ لباس؟

ج: ؎ فردوسی کا بدن پر لباس سجتا ہے

س: آپ کا پسندیدہ رنگ؟

ج: سرخ ہو سبز ہو کہ پیلا ہو
رنگ کوئی بُرا نہیں ہوتا

س: آپ کا پسندیدہ مشروب؟

ج: آبِ سادہ بہت ہے پینے کو
اور کیا چاہیئے ہے جینے کو

س: آپ کا پسندیدہ شہر؟

ج: ؎ کسی بھی شہر میں جاؤں غریب شہر نہیں

س: کھانے میں کون سی ڈش پسند ہے؟

ج: ؎ کوفتہ سا نانِ تہی کوفتہ است

س: اور پھل کون سا؟

ج: صبر کا پھل

س: مٹھائیوں میں کیا پسند ہے؟

ج: [illegible] پسند ہے۔ مٹھائیوں میں طبقات نہیں ہوتے، صرف مٹھائی ہوتی ہے۔

س: [illegible]

ج: [illegible] شعر کہنے کو خوب جی چاہتا ہے

س: کیا آپ توہم پرست ہیں؟

ج: نہیں۔ میں خدا پرست ہوں۔

س: کیا آپ کی اولاد میں سے کوئی ادب کی طرف آیا ہے؟

ج: ان میں سے دو ایک آغازِ سفر کی حدود میں ہیں۔

س: کیا آپ کی بیوی آپ کی تحریریں پڑھتی ہیں؟

ج: انہیں خانہ داری اور گھر بار ہی سے فرصت نہیں ملتی تاہم انہیں میر انیس کی شاعری بہت پسند ہے۔ پھر اس کے بعد اپنے مرحوم بھائی افتیار اختر

کی شاعری کو پسند کرتی ہیں۔ میرا نمبر ان سب کے بعد آتا ہے۔

س: آپ ٹیلی ویژن پر کسی قسم کے پروگرام دیکھتے ہیں؟

ج: "خبرنامے" کے سوا سب پروگرام دیکھتا ہوں۔

س: کس قسم کی فلمیں دیکھتے ہیں؟

ج: ان دنوں تو عموماً تماشائے اہلِ ادب دیکھتے ہیں

س: کیا آپ اپنے خاص دوستوں کا نام لینا پسند کریں گے

ج: دوستی تو خوشبو ہوتی ہے اور خوشبو کا کوئی نام نہیں ہوتا۔

اردو کے نامور نقاد

پروفیسر فتح محمد ملک

کی ایک خصوصی تصنیف

* احمد ندیم قاسمی ــــ شاعر اور افسانہ نگار *

جس میں ندیم کی شاعری اور افسانہ نگاری کا
متوازن تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے

قیمت : ۹۹ روپے

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

"تشبیب" اور "ہتھیلیوں پر چراغ" کے بعد خالد احمد اپنا تیسرا مجموعۂ کلام

// پہلی صدا پرندے کی //

پیش کرتے ہیں

اپنے قریبی بکسٹال سے
طلب کریں یا ہمیں لکھیں ــــ قیمت: ۰۰ روپے ــــ

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز
لوئر مال، لاہور۔

برگ و شبنم

سیّد مُنیر

کی بھرپور نظموں اور خوبصورت غزلوں کا دلکش مجموعہ

شائع ہو گیا ہے

قیمت : ۸۰ روپے

❀❀❀

سیّد مُنیر

کی دو اور کتابیں

۱۔ کائناتِ ثنا — حمدوں، نعتوں، منقبتوں اور سلاموں کا مجموعہ

۲۔ بہ زیرِ سایۂ گل — سقوطِ ڈھاکا کے المیہ کا دلدوز شعری اظہار

زیرِ طبع ہیں

اساطیر ۶/۳۹ ملک چیمبرز، لوئر مال، لاہور

انتہائی منفرد، بے حد حساس اور نہایت دلآویز شاعر

گلزار

کی نظموں، غزلوں اور "ترویٹیوں" کا خوبصورت مجموعہ

چاند پکھراج کا

بے مثال گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

قیمت : ۱۳۰ روپے

گلزار

ایک صاحب اسلوب افسانہ نگار بھی ہے

اس کے ۲۴ بے نظیر افسانوں کا مجموعہ

دستخط

زیر طبع ہے

اگلے مہینے تک نہایت آب و تاب سے شائع ہو جائے گا

****

اساطیر ۲۹/۶ مسلم چیمبرز، لوئر مال، لاہور

رِم جھم ، جلال و جمال ، شعلۂ گُل ، دشتِ وفا ، محیط اور دوام

کے بعد

احمد ندیم قاسمی

کا

تازہ ترین مجموعۂ کلام

لوحِ خاک

شائع ہوگیا ہے

رنگین سرورق ——— کپڑے کی جلد ——— قیمت : ۹۰ روپے

ناشر : اساطیر پبلشرز ، متصل سیشن کورٹ ، لوئر مال ، لاہور

التحریر

احمد ندیم قاسمی

کے پانچ شعری مجموعے

دلفریب گیٹ اپ کے ساتھ پیش کرتے ہیں

جلال و جمال	قیمت ۱۲۵ روپے
شعلۂ گل	قیمت ۱۲۵ روپے
دشتِ وفا	قیمت ۱۳۵ روپے
محیط	قیمت ۱۵۰ روپے
رم جھم (قطعات)	قیمت ۹۵ روپے

التحریر کبیر سٹریٹ۔ اُردو بازار۔ لاہور

ایک معروف مصری ناول

باتیں ایک خاتون ڈاکٹر کی

مصنف : نوال سعداوی
ترجمہ : طاہرہ حبیب
قیمت : ۵۰ روپے

اُردو افسانے کی ایک بھرپور شخصیت جیلانی بانو
کے تازہ افسانوں کا دلآویز مجموعہ

یہ کون ہنسا

قیمت : ۸۰ روپے

ناشر: کھوج ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز سنٹر
فلیٹ ۲، فلور ۱، غوثیہ بلڈنگ، گلبرگ مین مارکیٹ۔ لاہور
فون: ۵۷۱۲۲۶۲

احمد ندیم قاسمی

کی نظموں اور غزلوں کی کلیات

ندیم کی نظمیں (دو حصے)۔ (قیمت : ۸۰۰ روپے)

ندیم کی غزلیں (قیمت : ۴۵۰ روپے)

اور

ندیم کے خود منتخب کردہ چالیس افسانے

ندیم کے افسانے (قیمت : ۳۵۰ روپے)

انتہائی آب و تاب سے شائع ہوئے ہیں۔

سنگِ میل پبلی کیشنز۔ لوئر مال، لاہور

احمد ندیم قاسمی

کے قریب قریب سبھی مجموعے

شاعری اور افسانہ نگاری

اساطیر

نے انتہائی حسن و زیبائی سے چھاپ دیئے ہیں۔ اہلِ ذوق کے لئے عمدہ تحفہ ہے

لوحِ خاک	(شاعری)	۱۲۰۔ روپے
دوام	"	۱۲۰۔ روپے
نیلا پتھر	(افسانے)	۷۴۔ روپے
کپاس کا پھول	"	۱۲۰۔ روپے
گھاس سے گھنٹہ تک	"	۹۰۔ روپے
برگِ حنا	"	۹۶۔ روپے
بازارِ حیات	"	۱۰۰۔ روپے
سناٹا	"	۱۲۰۔ روپے
درودیوار	"	۹۶۔ روپے
آس پاس	"	۷۰۔ روپے

اساطیر۔ مکتبہ چیمبرز۔ دوتر مال۔ لاہور

خوبصورت شاعری کرنے والے

نجیب احمد

کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ

عبارتیں

شائع ہو گیا ہے

قیمت : ۱۲۰ روپے

جنگ پبلشرز - ڈیوس روڈ، لاہور

جدید طرزِ احساس اور جدید تر طرزِ اظہار
کے نوجوان شاعر

جاوید انور

کی شاعری کا اوّلین مجموعہ

شہر میں شام

قیمت: ۶۰ روپے

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز
۲۵- لوئر مال - لاہور

علامتوں، استعاروں اور لفظوں کو نئی معنویتوں سے آراستہ کرنے والے اور دورِ جدید تر کے نمائندہ شاعر

ایوب خاور کا اوّلین مجموعۂ کلام

گُلِ موسمِ خزاں

شائع ہو گیا ہے

قیمت : ۱۲۰ روپے

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز - لوئر مال - لاہور

اعلیٰ معیار کے حامل
اِنڈسٹریل ہوزز HOSES
اور
دیگر ربڑ کی مصنوعات

(ہوززبرائے پانی، ہوا
تیل، سٹیم اور گیس)

سکشن ہوزز　　پریشر ہوزز　　ڈیوری ہوزز

دیگر مصنوعات
دروازوں اور کار کے میٹ - ربڑ کورڈ رولر - ٹینک اور پائپ لائننگ
ربڑ اور انسرشن شیٹ - مولڈڈ مصنوعات - ریڈی ایٹر ہوزز
اور سائیکل ٹائیر و ٹیوب

DARSON ڈارسن

ڈارسن ربڑ ورکس
وزیرآباد - پی او بکس نمبر ۵ - فون ۲۱۷۱ - ۲۱۳۹ - ٹیلیکس ۴۵۹۵ - ہمایوں کے

گیس کی مصنوعات

چولہے

ہیٹر

کوکنگ رینج وغیرہ بنانے والے

انڈس گیس

ٹیلی فون :
۴۸۲۸۲۱
۲۱۱۴۵۳

۱۱۱ ۔ لٹن روڈ، لاہور

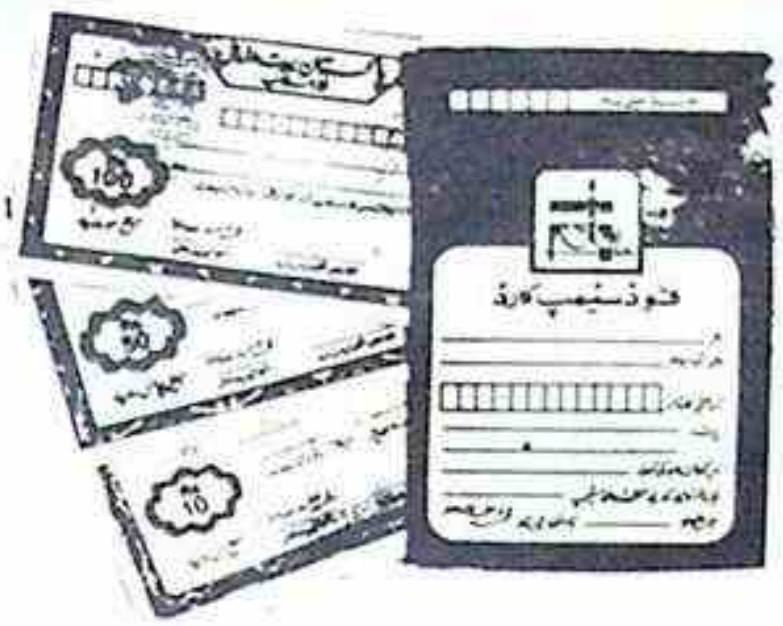

حکومتِ پاکستان کی فوڈ سٹیمپس سکیم

وزیراعظم پاکستان کی طرف سے غریبوں کی فلاح و بہبود کا ایک اور منصوبہ

- اگر آپ کی ماہانہ آمدنی ایک ہزار روپے تک ہے تو آپ پاکستان بیت المال کی فوڈ سٹیمپس سکیم سے مستفید ہو سکتے ہیں۔
- مقامی زکوٰۃ کمیٹیوں نے فوڈ سٹیمپس کے اہل افراد کی فہرستیں تیار کرنے کا کام شروع کر دیا ہے اور اب تک بیس لاکھ سے زیادہ پاکستانیوں کے کارڈ مقامی ڈاکخانوں سے جاری کئے جا چکے ہیں۔
- اس منصوبے کے تحت فوڈ سٹیمپس خاندان کے سربراہ اور زیرِ کفالت افراد کو مقامی ڈاکخانے سے مل سکیں گے۔ ان سٹیمپس کے عوض آپ اپنے قریبی یوٹیلیٹی سٹور یا کسی بھی دوکاندار سے آٹا، دالیں، کھانے کا تیل اور گھی حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کی سہولت کے لئے مقامی ڈاکخانہ چھ ماہ کی مالیت کے فوڈ سٹیمپس یک مشت فراہم کرے گا۔
- اگر آپ کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے میں ملازم نہیں ہیں، زکوٰۃ نہیں لے رہے اور آپ کی ماہانہ آمدنی ایک ہزار روپے تک ہے تو آپ درخواست فارم حاصل کرنے کیلئے فوری طور پر اپنی مقامی زکوٰۃ کمیٹی سے رابطہ کریں۔ فارم پُر کر کے وہیں جمع کرائیں۔ آپ کو بیت المال کارڈ اور سٹیمپس مقامی ڈاکخانے سے چار ہفتے کے اندر اندر فراہم کر دیئے جائیں گے۔
- پاکستان بیت المال نے ملک کے تمام ڈاکخانہ جات کو ضروری رقم فراہم کر دی ہے تاکہ دوکاندار حضرات فوڈ سٹیمپس کے عوض کاؤنٹر پر بلا تاخیر سادی رقم حاصل کر سکیں۔ تمام دوکاندار اس منصوبے میں شریک ہیں۔ ان سے درخواست ہے کہ وزیرِ اعظم کے اس فلاحی منصوبے میں حصہ لے کر اپنی آمدنی میں اضافہ کریں اور قوم و ملک کی خدمت کریں۔

پاکستان بیت المال لاہور

مرکزی زکوٰۃ انتظامیہ، وزارت خزانہ اسلام آباد پاکستان پوسٹل سروسز کارپوریشن اسلام آباد

PID(I) MPL Ibd

206mm x 3col

نیشنل بینک آف پاکستان

1991
اعلیٰ کارکردگی کا ایک مثالی سال

۱۹۹۱ء میں نیشنل بینک آف پاکستان نے ۹۵ کروڑ روپے کا قبل از ٹیکس منافع حاصل کیا جو پاکستانی بینکاری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح بینک کے ڈیپازٹس اور کل آثاثہ جات میں بالترتیب ۱۸ ارب روپے اور ۲۸ ارب روپے کا ریکارڈ اضافہ ہوا۔

Achievements

In Million Rupees

PRE-TAX PROFIT		DEPOSITS		TOTAL ASSETS	
1990	1991	1990	1991	1990	1991
371	**946**	87,900	**105,748**	135,074	**163,331**
Increase during 1991		Increase during 1991		Increase during 1991	
575 — 154.9%		**17.8 — 20.3%**		**28.3 — 20.9%**	
Rupees in Million		Rupees in Billion		Rupees in Billion	

نیشنل بینک آف پاکستان بینکاری کے تمام شعبوں میں اپنے ۴۶ لاکھ اکاؤنٹ ہولڈرز کو بہترین خدمات مہیا کرنے پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ بینک اپنے اکاؤنٹ ہولڈرز کے پاکستانی اور فارن کرنسی کے اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقوم پر پاکستانی بینکوں میں سب سے زیادہ منافع ادا کرتا ہے۔

جمع شُدہ رقوم اور ان پر واجب الادا منافع کو حکومت پاکستان کی طرف سے مکمل تحفظ حاصل ہے۔

آپ کی خدمت ہمارا افتخار

نیشنل بینک آف پاکستان

اعلیٰ خدمت مکمل تحفظ

ہیڈ آفس : آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ پاکستان
Telephones: 2416780-10 lines 2414041-5 lines
Telex 21034 20732 29067 20733 20179 20180 NBP PK Fax: 2416769

United

PID-I-19/92

کاروباری دُنیا کے معاملات سے مکمل آگاہی حاصل کریں

❖ ہفتے میں پانچ دن اور چوبیس گھنٹے — لمحہ بہ لمحہ

❖ ہر مالی معاملہ، غیر ملکی زرِ مبادلہ، ورلڈ سٹاک اور بانڈ مارکیٹیں، ورلڈ بلیٹین اور کوموڈیٹیس، کراچی ایکسچینج اور بہت کچھ .....

❖ سوموار (پیر) کی صبح، ٹوکیو اور ہانگ سے لے کر جمعہ کی دوپہر شکاگو کلوز تک آپ ہمارے جدید ترین رپورٹرز اور ٹیلیریٹ اپکوپمنٹ کے ذریعے، انتہائی اہم مالی اطلاعات مواصلاتی سیارے کے ذریعے براہِ راست حاصل کر سکتے ہیں۔

اپنے کاروبار کو مقابلے کی انتہا تک پہنچائیں
ایمپائر کلب کی رُکنیت حاصل کریں

اعلیٰ درجے کی اس رُکنیت سے متعلق فوائد سے مزید آگاہی حاصل کرنے کے لئے آج ہی رابطہ قائم کریں یا خود تشریف لائیں۔

رابطہ:- ۲۶۸۶۳۱ / ۲۶۸۶۵۸ (042)

ایمپائر ریسیورز پرائیویٹ لمیٹڈ

سیکنڈ فلور۔ الیٹ لائف بلڈنگ۔ ۱۵ اے ڈیوس روڈ۔ لاہور (پاکستان)

فیکس: ۲۶۸۶۴۲

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر پبلشر نے محمد شریف کے اہتمام سے طفیل آرٹ پرنٹرز، ۱۸۷ سرکلر روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر "فنون" ۶/۲ ملک چیمبرز لوئر مال لاہور سے شائع کیا

Golden Crisp

POTATO CHIPS

Saltish
Spicy
Lemon

Delicious Garnishing with fish, chops, cutlets, chicken, steak.
Taste fabulous by themselves - chip after chip after chip.

Standard Foods (Pvt) Limited

46 - Tipu Block, New Garden Town Lahore - 54000 Tel: 833919 - 837049
Fax: 832701 Tlx: 44498 HABIB PK

THE "FUNOON" QUARTERLY

REGD. L. No. 7579 Phone No. 215763

انسان نے سب سے پہلا قدم جب رُوئے زمین پر رکھا تو درختوں نے لہلہا کر، نباتات نے جھوم کر اور برگ و گل نے مسکرا کر انسان کا پُرجوش استقبال کیا۔

انسان نے چین محسوس کیا، وہ آغوشِ فطرت میں آچکا تھا۔ درخت اس کی غذا کا سامان بنے اور نباتات اور گل و برگ اس کے درد کا درماں بنے۔ قدرتِ فیاض نے رُوئے زمین کے چپے چپے پر نباتات پیدا کر دیئے ہیں اور انسان کی غذا اور دوا کا اہتمام کر دیا ہے۔

سائنس کی عظمتوں اور ٹکنالوجی کی رفعتوں نے بھی آخر کار انسانِ ارض کو آغوشِ فطرت میں جانے کے لیے آج بے چین کر دیا ہے۔

ہاں، انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ حتی الامکان دائرۂ فطرت سے باہر نہ جائے اور نباتات سے اپنے علاج معالجے کا سامان کرے۔ ہمدرد نباتات کے عالمی میدان میں گزشتہ کم از کم پچاس سال سے مصروف ہے اور دنیا کے ہر انسان کو ہمدرد نے دعوت دی ہے کہ وہ آغوشِ نباتات میں آئے۔ آج دنیا نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔

ہمدرد فطری علاج کا حامی ہے۔ آج کی دنیا فطری علاج کی خواہاں ہے۔

ہمدرد کی نباتی پیش رفتوں میں ایک نہایت موثر پیش رفت

ہمدرد
جوشینا
مدینۃ الحکمۃ
تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی مرکز
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع بین الاقوامی شہرِ علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔
جوشینا
Hamdard
BALM
نزلہ، زکام۔ جوشینا سے آرام
ہمدرد

Adarts-JOS-1/92